حضرت علیؑ ابن ابی طالب
اور
انکے سیاسی حریف
مولف
شاہد زعیم فاطمی
(فاضل دیوبند)

حضرت علی ابن ابی طالبؑ

اور اُن کے سیاسی حریف

از

علامہ سید زعیم فاطمی فاضل دیوبند

ناشر

عباس بک ایجنسی

رستم نگر، درگاہ حضرت عباسؑ لکھنؤ

نام کتاب : حضرت علی ابن ابی طالب اور ان کے سیاسی حریف

مولف : علامہ سید زعیم فاطمی فاضل دیوبند

ناشر : عباس بک ایجنسی

کمپوزنگ: شیعہ مشن، حسینن مارکیٹ، رستم نگر، لکھنؤ

سنہ طباعت : دسمبر ۲۰۰۳ء

مطبوعہ : ایس۔ایس۔انٹر پرائزز، دہلی

تعداد : ایک ہزار

نظر ثانی : حجۃ الاسلام مولانا ظہیر احمد خان افتخاری دام ظلہ العالی

ہدیہ : Rs. 45.00

ملنے کا پتہ

عباس بک ایجنسی

رستم نگر، درگاہ حضرت عباسؑ لکھنؤ

فون۔2647590 (0522) موبائل: 9415102990

e-mail: abbasbookagency@yahoo.com

انتساب

میں اپنی اس سعی ناتمام کو "ہدیہ زہیدہ" کے طور پر نور چشم پیغمبر سیدۃ نساء العالمین خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے حضور پیش کرتا ہوں۔۔۔۔

اگر دوعالم رود گئی در قبول   من دوست ودامان آل رسول

اور اپنے جذبات محبت وعقیدت کے اظہار کے لئے اقبالؔ کے ان اشعار کو وسیلہ بناتا ہوں۔

مریم از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز   از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز

نور چشم رحمۃ للعالمین !   آں امام اولین و آخریں

آں کہ جاں در پیکر گیتی دمید   روز گار تازہ آئیں آفرید

بانوے آں تاجدار "ہل اتیٰ"   مرتضیٰؑ، مشکل کشا، شیر خدا

پادشاہ و کلبہ ایوان او   یک حسام و یک زرہ سامان او

مادر آں مرکز پرکار عشق !   مادر آں کارواں سالار عشق

آں یکے شمع شبستان حرم   حافظ جمعیت خیر الامم !

تا نشیند آتش پیکار و کیں   پشت پا زد بر سر تاج نگیں

واں دگر، مولائے ابرار جہاں   قوت بازوئے احرار جہاں

در نوائے زندگی، سوز از حسین   اہل حق حریت آموز از حسینؑ

سیرت فرزندہا از امہات   جوہر صدق وصفا، از امہات

مزرع تسلیم را حاصل بتولؑ   مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

نوری وہم آتشی فرماں برش   گم رضایش در رضائے شوہرش

آں ادب پروردۂ صبر و رضا — آسیہ گردان و لب قرآں سرا ،

گریہ ہائے اُو زیادے بے نیاز — گوہر افشاندے بہ زبالیں نماز

اشک بر چید جبرئیل از زمیں — ہمچوں شبنم ریخت بہ عرش بریں

رشتۂ آئین حق زنجیر پاست — پاس فرمان جناب مصطفیٰ است

ورنہ گرد تربتش گردیدمے! — سجدہا بر خاک او پاشیدمے

فہرست مضامین

حملو کر کتاب ھٰذا منظر ایلیاد

باسمہ سبحانہ

پیش لفظ

اپنی تمام تر روسیاہیوں کے باوصف اور اپنے گناہگار ہونے کے اعتراف کے باوجود ایک راسخ العقیدہ مسلمان ایک محب اہل بیت نبوت نیز خانوادۂ بنی ہاشم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں ان بیہودہ الزامات اور بے سروپا اتہامات کی تردید کے لیئے جو چند بد نہاد لوگ علیؑ ابن ابی طالبؑ اور ان کی اولاد و امجاد کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ اپنے قلم کو حرکت میں لاؤں۔

ایک عرصہ تک میں اس بیہودگی کی مظاہرہ کا بچشم خود مطالعہ کرتا رہا جو نام نہاد اہل سنت کی بعض ذمہ دار شخصیتوں کی جانب سے سرزد ہوتے رہے لیکن تابہ کے؟

اب جب کہ ان "احباءِ سو" کے ساتھ ساتھ عامۃ الناس میں بھی ایسے دون فطرت لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں بد طینتی کے اس ناپاک کھیل کو سر عام کھیلنے لگے ہیں اور تحقیق و تاریخ کے نام پر توہین اہل بیتؑ کا ناموزوں سلسلہ چل نکلا ہے تو بادل نخواستہ "کلوخ انداز را پاداش سنگ است" کے مصداق ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے چہروں سے نقاب سرکا دیا جائے جنھیں اگر غور کی نظر سے دیکھا جائے تو پتہ چلے کہ:

ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اس کے بعد "پردہ اٹھتا ہے" کے عنوان سے ایک اور کتاب کی ترتیب بھی ہمارے پیش نظر ہے جس میں ہم بعض نامور شخصیتوں اور اہل سنت کے بعض ایسی ہستیوں کے رخ کردار سے پردہ اٹھائیں گے جس کو آج تک عصمتِ انبیاء کا سا تقدس حاصل رہا ہے اور تب پتہ چلے گا کہ اہل سنت جہاں کھڑے ہیں وہاں ان کے پاؤں کے نیچے زمین نہیں ہے۔

أنا شجرة الوادي اذ امارق حمت

واذا نطقت فانني الجوزاء

باسمہ سبحانہ

قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَاَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ۔

(اے رسول) کہیے آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو۔ اور ہم اپنی عورتوں کو بلائیں اور تم اپنی عورتوں کو۔ اور ہم اپنی جانوں کو بلائیں اور تم اپنی جانوں کو اس کے بعد ہم سب مل کر (خدا کی بارگاہ میں) گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں (آل عمران پارہ ۳ رکوع ۱۵ آیت ۶۱)۔ ﴿آپ اس شان سے برآمد ہوئے کہ امام حسینؑ کو گود میں لیا امام حسنؑ کا ہاتھ پکڑا جناب فاطمہؑ کو اپنے عقب میں کیا اور حضرت علیؑ کو ان کے پیچھے بیٹوں کی جگہ نواسے، عورتوں کی جگہ اپنی بیٹی اور اپنی جان کی جگہ حضرت علیؑ کو لیا بیٹے حسنؑ حسینؑ، عورت (بیٹی) فاطمہؑ نفس رسول علی مرتضیٰ قرار پائے۔ آگے آگے نبوت بیچ میں عصمت پیچھے امامت ۔ نبوت وامامت کے درمیان عصمت کی کیا شان فاطمہ تھی! علیؑ محافظ عصمت ونبوت تھے۔﴾

یہ اشعار فضل بن عباس بن عبدالمطلب نے خاندان بنی امیہ سے مخاطب ہو کر کہے تھے آج بھی وہ لوگ ان اشعار سے مخاطب ہیں جو بنی امیہ کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔

مهلا بني عمنا مهلا موالينا

لا تنبشوا بيننا ما كان مدفونا

مهلا بني عمنا تحت اثلتنا

سيروا رويداً كما كنتم تسيرونا

لا تطمعوا ان تهینوننا

وان نکف الاذی عنکم وتوذونا

والله یعلم انا لا نحبکم

ولا نلومکم ان لا تحبونا

کل له نیة فی بغض صاحبه

بنعمة الله نقلیکم و تقلونا

(کتاب الحماسه)

اے ہمارے بنی عم! ہمارے قرابت دارو! ہم پر کچھ مت اُچھالو! اپنی اس حرکت سے باز آجاؤ اور وہی چال چلو جو اس سے پہلے چلتے آئے ہو۔ ہم سے یہ توقع مت رکھو کہ تم ہمارے توہین کے درپے ہو گے تو ہم تمہارا احترام کریں گے اور تم ہمیں اذیت پہنچاؤ گے تو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے؟ اللہ جانتا ہے کہ ہمیں تم سے قطعاً محبت نہیں ہے ورنہ تم ہم سے محبت کا سلوک کیوں نہیں کرتے، ہر شخص دوسرے شخص سے کس خاص مقصد کے تحت دشمنی رکھتا ہے ہماری تمہاری دشمنی کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں اپنے خصوصی انعامات سے کیوں نوازا؟ راقم الحروف مسلکاً اہل سنت والجماعت کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے میرے خاندان میں دور دور تک شیعیت کا نشان نہیں ملتا، خاندانی ماحول اور ابتدائی تربیت نے شیعہ مکتبہ فکر کے بارے میں بچپن ہی سے ذہن وضمیر میں ایک گونہ عصبیت پیدا کر دی تھی۔

مطالعہ کی کمی اور تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر دل ودماغ کا سانچہ اس انداز میں ڈھل چکا تھا کہ آج سے چند برس پہلے تک خلافت راشدہ کے باب میں میری دیانتدارانہ رائے یہ تھی کہ خاکم بدہن حضرت علی ابن ابیطالبؑ کرم اللہ وجھہ کی ہوس اقتدار نے ان تمام فتنوں کو

جنم دیا جن سے اسلام کے دامن تاریخ داغ داغ ہے۔ بے تکلف دوستوں کی مجلس میں بارہا میں نے اس تاثر کا برملا اظہار کیا اور ان چگادری قسم کے اہلسنت حضرات سے اپنی بات کی داد وصول کی جو معاویہ کی ذات پر معمولی سی تنقید سن کر چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں۔ میں تعصب، تنگ نظری، اور جہالت کی اُسی ڈگر پر چل رہا تھا کہ اسی دوران رسوائے زمانہ اور بدنام مصنف محمود احمد عباسی کی کتاب "خلافت معاویہ ویزید" کا چرچا ہوا میں نے بھی بڑے شوق سے اس کتاب کا مطالعہ کیا لیکن میری ذہنی خارجیت کے باوجود یہ کتاب حلق سے نیچے نہیں اُتر سکی اور میں نے محسوس کیا کہ کتاب کا مصنف واقعات کی ترتیب اور اُنکے تجزیہ میں حاشیہ آرائی اور رنگ آمیزی کر رہا ہے اور اپنے مزعومہ مفروضہ حقائق کو درست ثابت کرنے کے لئے عبارتوں کے سیاق وسباق کو نظر انداز کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ اور جھجک محسوس نہیں کرتا۔ تاریخی کتابوں کی ورق گردانی اور واقعات کے بے لاگ تجزیہ سے یہ انکشاف ہوا کہ حضرت علی ابن ابیطالبؑ پر نقد وجرح کا یہ انداز نہ صرف جارحانہ اور غیر منصفانہ ہے بلکہ تاریخی حقائق وشواہد کے سر سر خلاف بھی ہے۔ اس کتاب کا ہمارے مذہبی طبقوں میں بالخصوص دوں نہاد ملاؤں پر جو اثر بد مرتب ہوا وہ حد درجہ حیران کن تھا یہ لوگ اس بات پر بغلیں بجا رہے تھے کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ علم وتحقیق کے نام پر اہل بیت نبوت کی عظمت کو مجروح کرنے کی کوشش کی پھر اچانک یہ خبر ملی کہ ملتان میں یوم معاویہ منانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک شر انگیز اشتہار بھی نظر سے گزرا جس سے طبیعت میں سخت تکدر پیدا ہوا۔

یہ ذہنی اور فکری بدمعاشی ممکن ہے برداشت کر لی جاتی لیکن مختلف حلقوں میں اس کے جو اثرات ظاہر ہوئے اُن کے مطالعہ کا راقم الحروف کو بڑا تلخ تجربہ ہوا اور اندازہ یہ ہوا کہ فکری ونظری گمراہی اور اعتقادی بے راہ روی کی یہ تحریک ملت اسلامیہ کے لئے کس درجہ

مہلک اور رسوا کن ہے۔

اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے علی ابن ابیطالبؑ سے شکوہ برلب ہیں اور انہیں کوس رہے ہیں۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا تھوڑا بہت جو احترام دلوں میں پہلے تھا وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا اور گز گز بھر کی زبانیں اُن کے خلاف زہر اُگلنے لگیں (راقم الحروف نے اہلسنت کے بعض ذمہ دار حضرات سے اس بارے میں جو ریمارکس حضرت علی ابن ابیطالبؑ کے بارے میں ملے وہ "نقل کفر کفر نہ باشد" ہم یہاں محض اس لئے پیش کر رہے ہیں تا کہ اندازہ ہو کہ یہ لوگ کس مقام پر کھڑے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا "اسٹالن کا مرنے کے بعد جو حشر برپا ہوا وہی حضرت علی ابن ابیطالب کا ہونا چاہیے تھا" دوسرے صاحب نے کہا کہ "تمام فتنوں کی جڑ علی ابن ابیطالبؑ کی ذات تھی"۔ "ہوس اقتدار علی ابن ابیطالبؑ کی زندگی کا حاصل ہے" یہ تیسرے کی رائے تھی۔ چوتھے نے کہا کہ علی ابن ابیطالبؑ خلافت کے اہل نہ تھے کیونکہ وہ مسخرے تھے اور یہ بات ایک ایسے شخص نے کہی جس کا باپ تقریر میں مسخرگی و مطربی کو پیشہ بنا کر ساری عمر قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہا پانچویں سوار اُٹھے اور اُنھوں نے یہ رائے پیش کی کہ "علی ابن ابیطالب شکل و صورت کے اچھے نہ تھے اسلئے مسلمان انھیں خلافت کی مسند کے لئے موزوں نہیں سمجھتے تھے۔اعا ذنا الله من هذاه الهفوات دائم علىٰ قائلها۔)

ایک خاص فرقہ کی مخالفت میں اعتدال کی حدود سے تجاوز نہ صرف قرآنی تعلیمات کی رو سے سراسر غلط تھا بلکہ اس سے احترام صحابہ کے اس عقیدہ کی بھی نفی ہوتی تھی جس کی دہائی دیکر یہ لوگ دوسروں کا منہ بند کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے یعنی کہاں تو وہ شورا شوری کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب سے گزر جانے والوں کے بارے میں

احتیاط اور زبان بندی کی تلقین اور کہاں یہ بے نمکی کہ سیدنا علی ابن ابیطالب جیسی شخصیت کے خلاف جو جس کے منہ میں آیا بکنا شروع کر دیا اور علم و تحقیق کے نام پر ایک طوفان بدتمیزی برپا کر دیا گیا۔

اس ناپاک جذبہ کی حوصلہ افزائی کا یہ عالم رہا کہ "خلافت معاویہ و یزید" کے بعد تاریخ اسلامی کے بدترین کردار یزید پلید کی سوانح عمری مرتب کی گئی اور مذہبی حلقوں میں اسے بھی قبول عامہ کی سند عطا کی گئی اور یزید ملعون کو اسلامی تاریخ کا نامور ہیرو تسلیم کر لیا گیا۔ ع

وائے گر در پس امروز بود فردائے

ایک دردمند مسلمان جو تعصب سے بالاتر اور نیک نیتی اور دیانت داری سے یہ چاہتا ہو کہ مسلمانوں میں باہمی اتحاد و اتفاق کے جذبات کو فروغ حاصل ہو وہ کبھی ان مذموم مساعی کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھے گا اور اسی بنا پر خاموشی اختیار کی گئی کہ آخر گڑے مردے اُکھاڑنے سے کیا حاصل؟ لیکن تابہ کے پچھلے تیرہ سو برس میں فرقہ وارانہ عصبیت کی بنا پر حقائق کو مسخ کیا جاتا رہا قرآن و سنت میں تحریف کی جاتی رہی تاریخ کو منہ چڑایا گیا اور خوب کو ناخوب بنا کر ذہنوں میں ٹھونسا جاتا رہا اور محض اس برتے پر کہ ایسا کرنے والے اکثریت میں تھے اُن کی نفری زیادہ تھی وہ تعداد میں بیشتر تھے۔

"لا يستوى الخبيث والطيب ولو اعجبك كثرة الخبيث"

(پاک اور ناپاک کبھی برابر ہو سکتے ہیں خواہ ناپاک لوگوں کی تعداد کیسی ہی حیران کن نہ ہو جائے۔ ارباب عقل و دانش اور اصحاب فکر و بصیرت کو اسلام دشمنی کا خطاب ملتا رہا اور اُمت محمدیہ کے ایک بہت بڑے حصہ کو یہ کہہ کر اس کے خلاف اتہامات تراشے جاتے رہے کہ یہ

لوگ عبداللہ ابن سبا کی جماعت کے لوگ ہیں اور عبداللہ ابن سبا تو یہودی تھا کبھی اُن پر قاتلان حسینؑ کی پھبتی کسی گئی کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جو خود ہی حسین کو قتل کرنے کے بعد اب خود ہی ان کی شہادت پر سینہ کوبی کر رہے ہیں کبھی اُنھیں یزیدیوں کی صف میں لا کھڑا کیا گیا اور کبھی اسلام دشمن طاقتوں کا ایجنٹ ثابت کیا گیا۔ اس پر بھی ان لوگوں کے دلوں میں بغض و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں پڑی تو اب اُن لوگوں کی تعریف میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں جن کے بارے میں پوری امت کا اجماع رہا ہے کہ وہ انتہائی بدکردار اور ظالم اور نا اہل تھے اس سلسلہ میں کبھی آغا خان کی سند حاصل کی جاتی ہے اور کبھی مستشرقین یورپ کی، کبھی بنو امیہ کی فتوحات کے سبز باغ دکھا کر لوگوں کو باور کرایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ تھے وہ سچے اور پکے مسلمان جنھوں نے "ساحل نیل سے لے کر کاشغر" کا علاقہ زیر نگیں کر لیا تھا (یہ ایک جاہ کن معاملہ ہے جس میں عام لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھوں اسلامی سلطنت کی توسیع ہوئی اور جن کے ذریعہ فتوحات کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔ اُنھیں برا مت کہو خواہ وہ خود کیسے ہی کیوں نہ ہوں بالخصوص عمرو بن العاص اور اسی قبیل کے دوسرے حضرات جنھوں نے علاقہ فتح کئے لیکن محض فتح مندی ایسا کوئی امتیاز نہیں جس کی بنا پر ایک بڑے شخص کی برائی کو نظر انداز کر دیا جائے حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے "اللہ اس دین کی تائید و امداد بدکاروں کے ہاتھوں بھی کرائے گا، پھر کیا اس سے اُس کی بدکاری اور اس کا فسق و فجور ختم ہو جاتا ہے یا وہ برے سے اچھا بن جاتا ہے ۔ ان الله يويد هذالدين با لرجل الفاسق

) اس لئے یہ مت دیکھو کہ اُنھوں نے اپنے عہد اقتدار میں ظلم و جور کیسا کچھ بازار گرم کیا تھا اور کتنے لاکھ انسانوں کو محض سیاسی اختلاف کی بنیاد پر کس بے رحمی اور سفاکی سے ذبح کر ڈالا ہے۔

تاریخ اسلامی کا مطالعہ

اس کتاب کا مصنف تاریخ اسلامی کا ایک غیر جانب دار طالب علم ہے اسلئے زیر نظر کتاب میں جہاں کہیں تاریخی واقعات سے استفادہ کیا گیا کہ وہ تمام تر سواد اعظم کی معتبر تاریخی کتابوں سے ماخوذ ہے شیعہ کتب تاریخ کا مطالعہ کا نہ کبھی اتفاق ہوا نہ میں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس کی ہے میرے نزدیک اور ہر مسلمان کے اعتقاد میں اس کائنات کی مستند ترین کتاب قرآن مقدس ہے اسلئے استدلال و استنباط میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کو دی گئی ہے یا پھر ان روایات کا حوالہ دیا گیا ہے جو اہل سنت والجماعت کے نزدیک مسلمہ اور قابل اعتماد ہیں۔

تاریخ کے بارے میں ایک بات خاص طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مورخ ہماری آپ کی طرح کے انسان ہوتے ہیں اُنکے بھی اپنے مخصوص رجحانات و میلانات ہوتے ہیں اور کسی واقعہ کے بارے میں اُن کا تاثر ایک عام آدمی کے تاثر سے چنداں مختلف نہیں ہوتا اس لئے مورخ کی ہر بات کو نوشتۂ آسمانی سمجھ لینا اور اُسے حرف آخر کی حیثیت دے دینا مناسب اور معقول طریقہ نہیں ہے مصلحت کا تقاضا بھی ایک، ناگزیر امر ہے۔ جس کو ہر شخص کسی نہ کسی حد تک ملحوظ رکھتا ہے اور مورخ اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، جان سب کو پیاری ہوتی ہے اور پیٹ ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا ہے۔

تاریخ نگاری ایک مشکل فن ہے اس فن کے حقیقی معیار پر بہت کم لوگ پورے اتر سکے ہیں افراط و تفریط اکثر و بیشتر مورخوں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ابن کثیر، ابن خلدون یا ابن خلکان، طبری ہو یا بلاذری مسعودی ہو یا یعقوبی۔ سب نے اپنے دور کے سیاسی حالات کو

ملحوظ رکھا ہے اور ہر مؤرخ کو بیرونی اور داخلی دباؤ سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

تاریخ کا عمل ہر دور میں یکساں رہا ہے موجودہ زمانہ میں جبکہ مواصلات رسل ورسائل، اخبارات وجرائد اور پیغام رسانی کے دیگر ذرائع بہ کثرت دست یاب ہیں کہ اُن کا عشر عشیر بھی گذشتہ دور کے مؤرخوں کو حاصل نہ تھا اس دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں ایک ہی ملک کے ایک حصہ میں عوام پر تشدد کا بازار گرم کیا جاتا ہے اور حکومت کے ایماء پر ملک کے دوسرے حصّوں کو کانوں کان خبر نہیں ہونے پاتی اور اخبارات اور ریڈیو اس خبر کا مکمل بلیک آؤٹ (Black Out) کرتے ہیں اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ آج سے بارہ تیرہ برس پہلے جبکہ خبر کی اطلاع کی اتنی سہولتیں فراہم نہ تھیں لوگوں کے پلے کیا پڑتا ہوگا اور بے چارے مؤرخین کو خانہ پوری کے لئے کیا کیا پاپڑ نہ بیلنا پڑتے ہوں گے۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ تاریخ کے مطالعہ کے دوران ایک دانشور انسان کے لئے موزوں طریقہ یہ ہے کہ وہ محض خبروں اور واقعات پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ اپنی دماغی سوجھ بوجھ سے بھی کام لے اور کھرے کھوٹے اور جھوٹ سچ میں بطور خود بھی امتیاز کرنے کی کوشش کرے۔ ایک مؤرخ کو تاریخ نگاری کے دوران کس قسم کے خارجی اور داخلی اثرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کی ایک مثال "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ہم یہاں پیش کرتے ہیں جس سے با آسانی واضح ہو سکتا ہے کہ ہمارے بعض نامور مؤرخ اس فن میں کس معیار پر تھے۔ مشہور مؤرخ ابن خلدون جسے مسلمانوں میں فن تاریخ کا امام سمجھا جاتا ہے اور جس کے "مقدمہ تاریخ" کی شہرت اپنوں سے بڑھ کر بیگانوں میں ہے اُنکی تاریخ دیانت اور مؤرخانہ قابلیت کا یہ حال ہے کہ اپنے اسی شہرہ آفاق "مقدمہ" میں بنی امیہ کے حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کی مدافعت کرتے ہوئے جہاں اپنا موقف کمزور پایا وہاں لکھدیا۔ "چونکہ خلافت راشدہ کی تیس سالہ مدت ختم ہو چکی تھی اور "ملک عضوض" کا آغاز

ہو چکا تھا اس لئے اس دور میں ظلم و تعدی کے واقعات عام تھے اور پُر آشوب دور میں اس قسم کی زیادتیوں کا وقوع چنداں مستبعد نہیں ہے۔" (تاریخ ابن خلدون ص ۲۱۹) لیکن تاریخ کی دوسری جلد میں معاویہ ابن ابوسفیان کی منقبت سرائی اپناتے ہوئے آپ نے اس حدیث کی صحت سے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ۔

"الخلافة بعدی ثلثون سنه ثم تکون ملکاً عضوضاً"

میرے بعد خلافت کا نظام تیس برس تک رہے گا پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔ کی حدیث صحیح ہے اور معاویہ کا شمار بھی خلفائے راشدین میں ہوگا۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

کتب تاریخ کی قرار واقعی حیثیت

تاریخ کی قدیم ترین کتابوں میں جو دوسری صدی ہجری میں مرتب ہوئیں ہیں بنی امیہ کی پرزور حمایت کی گئی ہے اور مختلف روایتوں کے ذریعہ اور جھوٹے سچے قصّے کہانیوں کے حوالہ سے بنی امیہ کی عظمت ثابت کرنے اور انھیں اسلام کا سچا خادم اور پیروکار ظاہر کرنے کا بہ طور خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس دور کے مؤرخوں میں الجعفی، ابن ہشام اور ابوالفرج اصفہانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں بالخصوص ابوالفرج اصفہانی تو بدترین تعصب کا شکار ہے اس شخص نے اپنی کتاب میں "مقاتل الطالبین" میں جو بس گھولا ہے اس سے اسکی خباثت نفس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ابوالفرج اصفہانی کی ایک اور مشہور کتاب "الاغانی" میں اس کا یہ خبث باطن پوری طرح آشکارا ہوا ہے۔ جسمیں اُس نے حضرت سکینہ بنت الحسینؑ کے بارے میں یہ غلط لکھا ہے کہ وہ اپنے دور کی بہترین پیشہ ور رقاصہ اور مغنیہ تھیں۔ معاذ اللہ! توبہ

تیجہ ٔ حسینؑ معصوم بچی پر بہتان عظیم ہے۔ امام عالی مقام کی شہادت کے بعد اہل حرم کتنے
سال زندان شام میں قید رہے؟ چھ، برس کے سن میں حضرت سکینہ یتیم ہوگئی تھیں۔ سکینہؑ بنت
الحسینؑ کا قید خانہ شام میں انتقال ہوگیا تھا۔ ع

یعنی سکینہ مرگئی یاد امام میں

تیسری صدی ہجری میں البتہ بعض ایسی کتابیں تاریخ کے موضوع پر لکھی گئیں جو
بہت حد تک قابل اعتماد ہیں اور جنھیں جرح وتعدیل کی رو سے ایک حد تک مستند قرار دیا جاسکتا
ہے ان میں سے زیادہ شہرت واستناد طبری کے حصہ میں آیا لیکن چونکہ طبری بنوامیہ کی تعریف
سے قاصر رہا ہے اور اہل بیتؑ نبوت کے بارے میں صحیح واقعات کا اُس نے التزام کیا ہے
اسلیئے یار لوگوں نے اُس پر رفض وشیعت کا الزام عائد کردیا حالانکہ تمام مورخین اس کی
ثقاہت اور علمی وفنی عظمت کے معترف ومداح ہیں۔ "ابن الندیم" نے کتاب "الفہرست"
میں ابو جعفر محمد بن جریر طبری کو ائمہ مجتہدین میں شمار کیا ہے۔ "ابن اثیرؒ" نے اپنی "تاریخ
الکامل" میں انھیں "اوثق من نقل التاریخ" مورخین میں سب سے زیادہ قابل اعتماد کے گرانقدر
خطاب سے یاد کیا ہے اور ابن خلکان نے "وفیات الاعیان" میں ان کے متعلق تصریح کی ہے
کہ:۔

"وکان ثقة فی نقله وتاریخه وهوا اصح التواریخ واثبتها"
"روایت ونقل میں نہایت قابل اعتماد ہے اور اُنکی تاریخ سب سے زیادہ صحیح اور مستند ہے"
"ابن کثیر، ابن خزیمہ اور ابن حجر عسقلانی نے انھیں" من کبائر الائمه "بہت بڑا امام قرار
دیا ہے ابن خلدون نے بھی اپنی تاریخ کی تیسری جلد میں تاریخ طبری کو انتہائی قابل اعتماد
قرار دیا ہے طبری کے علاوہ دیگر کتب تاریخ میں بھی بکثرت سے ایسی روایات موجود ہیں جن

سے خاندان بنی امیہ کی قرار واقعی حیثیت کی قلعی کھل جاتی ہے اور بعض ایسے نامور صحابہ کے
کارناموں کے پیچ ڈھیلے ہوجاتے ہیں جن کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ وہ انبیا کی طرح
ہر انسانی آلائش سے پاک، ہر غلطی سے مبّرا اور ہر گناہ سے معصوم تھے۔ یہ روایات صرف طبری
ہی میں نہیں بلکہ اُن مورخوں کی کتابوں میں بھی موجود ہے جنھیں اہلسنت نے اپنے اسلاف
میں شمار کرتے ہیں جن کی ثقاہت ودیانت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔

تاریخی کتب میں مشاجرات ومنازعات صحابہ کے باب میں جو مواد ملتا ہے اس کے
متعلق اہل سنت کا یہ عجیب اور متضاد رویہ رہا ہے کہ جہاں کوئی بات صحابہ کے خلاف پڑتی ہو
خواہ وہ روایت ودرایت کے مسلمہ اصول کے عین مطابق ہی کیوں نہ ہو وہ بلا تامل اس کا انکار
کردیں گے یا پھر اس کی ایسی توجیہہ کریں گے۔ ع

"من چی سرایم وطنبورہ من چی سراید"

والی کیفیت پیدا ہوجائے۔ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مذہبی درسگاہوں
دینی اداروں اور عربی مدرسوں میں مروّجہ درس نظامی میں تاریخ جیسے اہم موضوع پر ایک بھی
کتاب داخل نصاب نہیں ہے طلبہ کو تاریخ کے قریب پھٹکنے نہیں دیا جاتا کہ اُن پر حقیقت حال
منکشف نہ ہوسکے اور مزعومہ عقاید کا بھرم نہ کھل سکے۔

ہماری کتب تاریخ کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مورخین نے عموماً محض تاریخی
واقعات کے نقل کردینے پر اکتفا کیا ہے اور ان راویات کے تجزیہ سے مطلقاً بے اعتنائی برتی
ہے تاریخ کا ایک طالب علم ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ واقعات کے
پس منظر کو دانستہ طور پر معرض اخفا میں رکھا گیا تا کہ شخصیت کی عظمت پر حرف گیری کا امکان نہ
رہے حالانکہ تاریخ اظہار عقیدت کا نام نہیں ہے اس کا مقصد تو صرف حقائق کی نقاب کشائی

ہوتا ہے مگر ہمارے مؤرخوں کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے باستثنائے چند تاریخ کو قصیدۂ مدحیہ میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اور یوں اپنے ممدوحین کی کے حق میں وہ ہوا باندھی کہ بیچارے ناقدین فن تاریخ دم بخود ہو کے رہ گئے۔

ایک غلط فھمی کا ازالہ

ہمارے زمانے کے بعض تجدد پسند لوگ نے تاریخ اسلامی کے اس خلفشار اور صحابہ کی باہمی چپقلش سے نپٹنے کا بڑا آسان نسخہ دریافت کیا ہے ان کا کہنا یہ ہے صحابہ کے باہمی تنازعات کے بارے میں جتنی روایتیں اور واقعات کتب تاریخ وسیر میں مذکور ہیں سب کے سب اسلام دشمن طاقتوں کی ذہنی اختراعات ہیں جن کا مقصد مسلمانوں کو بدنام اور رسوا کرنے اور انھیں اپنے اسلاف سے بدظن کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا اس موقف کی تائید میں وہ قرآن مقدس کی آیت پیش کرتے ہیں:۔ "محمد رسول اللہ والذین معه اشداء علی الکفار و رحماء بینهم"۔ " محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں بڑے سخت گیر مگر آپس میں بڑے رحم دل ہیں"

اس آیت سے جو غلط فہمی اُن لوگوں میں پھیل گئی ہے وہ نتیجہ ہے اس غلط تصور کا کہ انھوں نے اس آیت کو ایک پیش گوئی سمجھ لیا حالانکہ اسمیں محض یہ اصول پیش کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دینے والے لوگ "رحماء بینهم" کی صفت سے متصف ہوتے ہیں۔ ایک اور غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ "الذین معه" میں کس قسم کی معیت مراد ہے۔ کیا اُن لوگوں کی جمعیت حضوؐر کے ارد گرد موجود رہتے تھے یا اس آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ مقصود ہے جو صدق دل سے ایمان لائے اور عملی طور پر حضور کے ساتھی، معاون اور مددگار بنے۔ اس

آیت کا سیاق وسباق بتا رہا ہے کہ اس معیت سے مراد غیر متزلزل پائیدار غیر مشروط اور شب و روز کی ایسی رفاقت ہے جو صحبت وتربیت نبوت سے براہ راست فیضیاب ہوتی رہی اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس قسم کے حضرات کبھی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا اور نبرد آزما نہیں ہوئے اور کبھی اُن میں کوئی اختلاف رونما ہوا تو اُن کا باہمی معاملہ شفقت ورحمت اور رافت وکرم کا رہا۔ اور یہ بھی ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس گراں قدر معیت سے بہرہ ور لوگ جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کی فوج ظفر موج میں شریک تھے اور معاویہ کے خلاف جنگ میں انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ساتھ دیا۔ (اخبار الطوال ص ۱۷۳، طبری ج ۶)

آئینہ کیوں نہ دوں کے تماشا کھیں جسے

مسلمان اپنے ماضی پر بڑا فخر کرتے ہیں اور اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ عظیم الشان شخصیتیں تھیں کہ چشم فلک نے آج تک اُن کی نظیر نہیں دیکھی اور آئندہ کے لئے اُن کے خیال میں مادر گیتی ہمیشہ کے لئے بانجھ ہو کر رہ گئی۔

اول تو یہ بات ہی سرے سے غلط ہے کہ مسلمانوں کا عہد ماضی تابناک ہے اور ان کے اسلاف مثالی کردار کے لوگ تھے عہد صحابہ سے لیکر صلاح الدین ایوبی تک کے دور کے حالات کا جائزہ لیجئے تو اندازہ ہوگا کہ جس دور کو انسانیت کا عہد زریں کہا جاتا ہے اس میں عوام کو چھوڑیے خواص کی اخلاقی پستی وفکری وعلمی زبوں حالی کا کیا عالم تھا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد صحابہ میں چپقلش کا آغاز ہوا تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئی۔ انتخاب خلیفہ کے سلسلہ میں جو ہنگامہ کھڑا کیا گیا وہ ایک تاریخی واقعہ

ہے۔جس طرح حضرت ابوبکر کو خلیفہ بنایا گیا اور اس موقع پر جس قسم کی دھاندلی روا رکھی گئی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اس کا اوّلی ثبوت سعد بن عبادہ کا قصہ ہے جنھیں صرف اس جرم میں کہ وہ علیؑ ابن ابی طالب کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے اس بے دردی سے مارا پیٹا اور پاؤں تلے روندا گیا کہ یہی صدمہ ان کے لیئے جان لیوا ثابت ہوا۔ یہ سعد بن عبادہ اصحاب بدر میں سے اور انصار مدینہ کے معزز و محترم سردار تھے۔ آگے چلئے ایک فرضی اور سراسر جعلی حدیث کا سہارا لے کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اکلوتی اور حقیقی صاحبزادی حضرت سیّدہ فاطمۃ الزہراؑ کو حضور کے ورثہ سے جس طرح محروم کیا گیا وہ بذات خود ایک المیہ ہے اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جانشینان پیغمبرؐ کو ان کی ذات گرامی سے کیسا کچھ تعلق تھا۔ ابوبکر صدیق کی خلافت ان حالات میں منعقد ہوئی کہ اہل بیت نبوت پیغمبرؐ کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے نہ ان سے اس بارے میں مشورہ لیا گیا نہ ان کی رائے کو کوئی اہمیت دی گئی نہ یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ پیغمبر صلی اللہ وآلہ وسلم کے ورثاء میں سے کسی ذمہ دار فرد کو اس انتخاب کے مسئلہ میں شریک کیا جائے حالانکہ اہل بیت نبوت کے دینی خدمات کسی سے کم نہیں تھیں۔ انھیں اصحاب علم ورائے موجود تھے ان کو قرابت نبوی کا گراں مایہ شرف بھی حاصل تھا اور وہ حضورؐ کے جائز اور حقیقی وارث تھے لیکن انکے اس حق وراثت کو یہ کہکر باطل کرنے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبرؐ کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔

پھر جس شخص نے بھی اس ظلم اور صریحاً زیادتی کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اسے ختم کرنے اور بزور شمشیر چُپ کرانے کی کوشش کی گئی اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس دعوائے باطل کی بناء پر باغ فدک کے اس قطعۂ اراضی کو غصب کرلیا گیا جو حضورؐ نے اپنے حین حیات میں اپنے اہل بیتؑ کے لئے مخصوص فرما دیا تھا۔ (اہل بیت نبوت اس حدیث کو سراسر

جھوٹ تصور کرتے تھے اس کا احساس عمر ابن خطاب کو بھی تھا۔ (مسلم، ج ۲ ص ۹۱) اور جب سیّدہ نساء العالمین حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا نے اس ناانصافی پر احتجاج کیا تو انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ پیغمبر کے مال پر وراثت کا قانون لاگو نہیں ہوتا۔ تاریخ و حدیث کی معتبر کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ سیّدہ فاطمہ بنت محمد علیہا السلام نے باقاعدہ اس حق کا مطالبہ فرمایا۔ (بخاری کتاب الفرائض ص ۸۷، کتاب الخمس ۲، ایضاً مسلم ج ۲ ص ۹۱)

جن لوگوں کے سامنے سیرت فاطمہؑ کے زہد و ورع اور فقر و قناعت کا پہلو موجود ہے۔ وہ کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ سیّدہ فاطمہؑ کا یہ مطالبہ کسی لالچ و خودغرضی یا حرص و آز کی بناء پر تھا، جس معصومہ و عفیفہ کے فقر و توکل کا یہ عالم رہا ہو کہ اس کے نازک نسوانی ہاتھ چکی پیس پیس کر سخت اور کھردرے ہو گئے ہوں اور بقول اقبالؔ:

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا

وہ محض ایک قطعۂ زمین کے لیئے اس بے تابی کا مظاہرہ کریں عقل کبھی اسے باور نہیں کر سکتی، یہ وہی فاطمہؑ بنت محمدؐ ہیں جن کے بارے میں ان کے مقدس باپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

"فَاطِمَةُ بَضْعَةُ جَسَدِیْ یریبنی ما ارابها و یُئو ذِیْنِیْ" مَآاٰذاھَا"
(فاطمہؑ میرے جسم کا ٹکڑا ہے اس کی پریشانی اور اس کا دکھ میرا دکھ ہے۔)

ایک دوسری روایت میں ہے۔

فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّی فَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِی

ترجمہ: فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھ کو ناراض کیا۔

(بخاری ج ۳، باب مناقب فاطمہؑ سطر ۲۶ ص ۵۰۷ ایضاً ترمذی ۲ ص ۲۲۸)

حضرت فاطمہؑ سے حضورؐ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت فاطمہؑ:

اِذَا دَخَلَتْ عَلَى النَّبِیِّ قَامَ اِلَیْھَا فَقَبَّلَھَا وَ اَجْلَسَھَا فِی مَجْلِسِہٖ

جب حضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتیں تو حضورؐ کھڑے ہو جاتے انھیں چومتے اور اپنی جگہ انھیں بٹھاتے۔ (ترمذی ج ۲ ص ۲۳۹)

باغ فدک کے معاملہ میں حضرت فاطمہؑ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا۔ بخاری کی روایت ہے حضرت فاطمہؑ اس پر حضرت ابوبکر سے ناراض ہوگئیں۔

فَوَجَدَتْ فِیْ ذَالِكَ فَاطِمَةُ فَھَجَرَتْہُ فَلَمْ تُكَلِّمْہُ حَتّٰی تُوُفِّیَتْ

حضرت فاطمہ زہراؑ اس فیصلہ سے دل گیر ہوگئیں۔ انھوں نے ابوبکر سے قطع تعلق فرمالیا اور پھر زندگی بھر ان سے ہمکلام نہ ہوئیں۔

اور چلیئے ایک لحہ کے لیئے یہ بات تسلیم کر لیجئے کہ وراثت کے باب میں وہ حدیث جو بڑے شد و مد کیساتھ پیش کی جاتی ہے اپنی جگہ صحیح تھی۔ جب بھی یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے تھی کہ مُرَوّت انسانی صفات کمال میں اعلیٰ جوہر ہے جسے اخلاق عالیہ کا ماحصل اور خلاصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ سوچیئے مروّت کا تقاضا کیا تھا؟ جس پیغمبرؐ کی مروّت کا یہ عالم رہا ہو کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی جیسے شخص کے جنازہ میں آپ نے شرکت فرمائی ہو اسکی تکفین و تدفین میں آخر تک شریک رہے ہوں جس کی عمر بھر کی دشمنی خاطر میں نہ لائے ہوئے اپنا پیراہن مبارک اسکے کفن کے لیئے عطا فرمایا ہو اور پھر دیر تک اسکی قبر پر کھڑے رہے ہوں، خود اسکی چہیتی و اکلوتی بیٹی کے ساتھ اس کی اُمّت اتنی مروّت بھی نہیں کر سکی جیسی کچھ مروّت وہ

اپنے دشمنوں کے ساتھ عمر بھر کرتے رہے۔ سیّدہ فاطمہؑ اپنا جائز حق مانگ رہی تھیں انھیں ان کے حق سے محروم کرنے کے لیئے پیغمبرؐ کا ایک قول گھڑ لیا گیا۔

وضع حدیث کا یہ صریحاً پہلا ارتکاب تھا جو اسلام کے خلیفہ اول نے کیا انھوں نے اہلبیت نبوت کو ورثۂ نبوّت سے محروم رکھنے کے لیئے ایک ایسی حدیث وضع کی جو بیسیوں آیات قرآنیہ اور نصوص قطعیہ کے سراسر خلاف تھی۔ عرب کے ان پڑھ بادیہ نشینیوں کو یہ کہہ کر اپنا ہمنوا بنالیا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وراثت کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو حضورؐ کی نبوّت معرضِ خطر میں پڑ جائیگی کیونکہ انبیاء کے یہاں وراثت کا اصول نہیں چلتا۔ حالانکہ معاشرۂ انبیاء میں وراثت ایک سنت جاریہ و ثانیہ رہی ہے۔

یہ واقعہ بھی عہد ابوبکرؓ کے دوران پیش آیا انکی افواج کے سپہ سالار خالد بن ولید نے عین میدان جنگ میں ایک مسلمان مالک بن نویرہ پر کفر و ارتداد کا فتویٰ عائد کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور اسکی خوبرو بیوی سلمیٰ سے ایام عدّت ہی میں شادی رچائی، عربوں میں اس عورت کے حسن و جمال کا بڑا چرچا تھا مالک بن نویرہ کی مظلومانہ موت پر اسکے بھائی متمم بن نویرہ نے جو مرثیے لکھے وہ عربی ادب میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر یہ تین شعر تو بہت مشہور ہوئے۔ (کتاب الحماسہ، باب المراثی)

لقد لامنی عند القبور علی البکاء

رفیقی لتذراف الدموع السوافك

میرے ساتھی نے مجھے قبروں کو دیکھ کر رونے اور آنسو بہانے پر ملامت کی۔

فقال اتبکیٰ کل قبر رأیته

لقبر ثویٰ بین اللوی والدکادك

اور کہا کہ اس ایک قبر کو یاد کر کے جو مقام لوی اور دکادک کے وسط میں واقع ہے تم ہر قبر کو دیکھ کر رونے کیوں لگتے ہو۔

فقلت له ان الشجا يبعث الشجا

فدعنی فهذا كله قبر مالك

میں نے اس سے کہا کہ ایک غم دوسرے غم کو انگیز کرتا ہے۔ یہ سب میرے بھائی مالک ہی کی قبریں ہیں اسلیئے مجھے رونے دو کہ ان قبروں کو دیکھ کر میرا غم تازہ ہو گیا ہے۔ جب خالد بن ولید نے مالک بن نویرہ کو قتل کرنے کے بعد اس کی بیوی کو اپنے حبالہ عقد میں لے لیا تو بہت سے لوگوں نے جن میں عمر پیش پیش تھے ابو بکر سے مطالبہ کیا کہ اس جرم کی پاداش میں سپہ سالاری اس کے عہدے سے ہٹا کر ان کے خلاف تادیبی کاروائی کی جائے لیکن خلیفۂ وقت نے یہ کہہ کر سب کا منہ بند کر دیا کہ خالد کی فوجی خدمات کی بنا پر ان کیخلاف تادیبی کاروائی میرے نزدیک نامناسب ہے۔ تعجب ہے کہ خالد بن ولید کے معاملہ میں اس قدر مروّت برتنے والا شخص فاطمہؑ بنت محمدؐ کے معاملہ میں اسکے عشر عشیر مروّت کا کا ثبوت بھی نہیں دیتا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''جو شخص مروّت سے تہی مایہ ہو اسکی عبادت بھی اللہ کے یہاں قابل قبول نہیں'' نیز فرمایا ان صدق العهد من الايمان (تعلق کی پاسداری ملحوظ رکھنا ایمان کا گزیر تقاضا ہے)

شیخین

تاریخ بتاتی ہے کہ ابو بکر صدیق کو خلیفہ بنانے میں عمر کا ہاتھ تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضورؐ کے وصال کے بعد جو ڈرامہ کھیلا گیا اس کا مرکزی کردار عمر ابن خطاب کی ذات تھی۔

ابو بکر کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ زیادہ دیر تک داد خلافت نہ دے سکے لیکن اپنی وفات سے قبل وہ عمر کو اپنا جانشین نامزد فرما گئے۔

پیغمبر اسلامؐ اور مہبط وحی ورسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تو یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ وہ اپنی خلافت جیسے اہم مسئلہ کو امت کی صوابدید پر چھوڑ گئے تھے پھر یہ نامزدگی بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ جو کام حضورؐ سے نہ ہو سکا اس کی جرائت ابو بکر کو کیونکر ہوئی انہیں اس کی سند جواز کہاں سے مل گئی؟

مسئلہ وراثت میں حضورؐ کا فرمان یاد رہا لیکن نامزدگی کے معاملہ میں حضورؐ کے طرز عمل اور اسوۂ حسنہ کا بھولے سے بھی خیال نہ آیا۔ یہ فلسفہ و منطق کی گتھیاں نہیں ہیں کہ انہیں سلجھانے کے لیئے کسی ارسطو اور بقراط کی ضرورت پیش آئے سیدھی سادی باتیں ہیں جن سے ایک معمولی عقل کا آدمی بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ ہماری تاریخ کن مراحل سے گزری ہے اور کن داخلی عوامل اور خارجی اثرات کا انکی ترتیب وتدوین میں ہاتھ ہے۔

قتل عثمانؓ کو یہودیوں کی سازش قرار دینے والے اس فکری وعملی تضاد کو نہ جانے کس نام سے تعبیر کریں گے۔ (یہودیوں کی سازش کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے مگر نا سمجھ لوگ نہیں سوچتے کہ اسلامی مملکت کے جس عروج کے بارے میں لوگوں کو اب تک یہ بات یہ یاد کرائی جاتی رہی ہے کہ عالم ملک نے اس جیسی شان وشوکت اور سطوت وحشمت والی حکومت کی نظیر

نہیں دیکھی وہ ایسی بودی لچر پوچ شان و شوکت تھی جسے ایک یہودی عبداللہ ابن سبا کی سازش نے تہس نہس کر کے رکھ دیا اور بیشتر صحابہ بھی اس رو میں بہہ گئے۔

کیا مضبوط اور عوام پسندیدہ حکومتیں کسی بے اثر شخص کی سازش سے اس طرح انتشار کا شکار ہو جایا کرتی ہیں۔ اور کیا وہ صحابہ جنھیں مافوق البشر اور معصوم عن الخطا اور نہایت زیرک و دانا ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا ہے اتنے ہی سادہ لوح اور ناپختہ ذہن کے حامل تھے کہ ایک یہودی کی دسیسہ کاروائیوں میں ملوث ہو کر خود اپنے دین و مذہب کا تیا پانچہ اور خفیہ سازش کا اس آسانی سے شکار ہو گئے؟۔)

عمر ابن خطاب کا دور اگرچہ فتوحات کا دور ہے لیکن عہد خلافت میں اسلام کے دشمن ابوسفیان کے دو بیٹوں کو یکے بعد دیگرے مملکت اسلامیہ کے سب سے زرخیز اور شاداب خطہ کی گورنری سے سرفراز کیا گیا حالانکہ قران کی تصریح کے مطابق اگر یہ لوگ نیک نیتی سے مسلمان ہوتے تب بھی ان کی حیثیت السابقوالاولون سے کہیں فروتر تھی۔ قران کہتا ہے:۔

"لایستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئك اعظم درجه من الذین انفقوامن بعد وقاتلوا"۔

فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والے اور راہ حق پہ اپنا سب کچھ لٹا دینے والے اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے کبھی ایک برابر نہیں ہو سکتے وہ لوگ بعد میں ایمان لانے والوں سے مرتبہ و مقام کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ اکابر صحابہ کی موجودگی میں ابوسفیان کے بیٹے یزید کو دمشق کا گورنر بنا دیا گیا اور جب وہ مر گیا تو اس کے چھوٹے بھائی معاویہ کو اس عہدہ پر متمکن کر دیا گیا۔ یہاں کسی کی اسلامی حمیت بیدار نہیں ہوتی، کسی کی غیرت دینی میں اشتعال پیدا نہیں ہوتا اور کسی کو یہ اعتراض نہیں سوجھتا کہ ایک خاندان کے دو افراد کو جو

کے بھائی ہیں اس اعزاز سے کیوں نوازا گیا؟۔ جبکہ یہ دونوں نہ اصحاب بدر میں سے ہیں نہ بیعت رضوان میں شریک ہوئے نہ ہجرت کا اعزاز اُن کو نصیب ہوا۔ بلکہ ان کا اسلام فتح مکہ کا رہین منت ہے۔ اس موقع پر کسی کو اس کھلم کھلا "موروثیت" کے خلاف لب کشائی کی جرائت نہیں ہوئی اور کوئی شخص حرف شکایت زبان پر نہیں لاتا کہ اگر پیغمبر کے اہلبیت کے لئے وراثت شجر ممنوعہ ہے تو ابوسفیان کے بیٹوں کے لئے اس کا جواز کہاں سے مہیا ہو گیا؟۔

ابوسفیان کے ان دونوں بیٹوں نے دمشق میں بیٹھ کر اپنے عہدہ و منصب سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ بنی امیہ کی حکومت کے قیام کے لیئے راستہ ہموار کیا۔ سیاسی رشوت کا بازار گرم کیا اور شام کے پورے صوبہ میں ایک متوازی حکومت کی داغ داغ بیل ڈالی۔ جس نے بعد میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے عہد خلافت میں مرکز سے بغاوت کی۔ واقعہ یہ کہ عمرؓ کے اس سیاسی اقدام کے لیئے اخلاقی جواز مہیا نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے عرب کا سب سے زیادہ زرخیز صوبہ بنی امیہ کی تحویل میں دے دیا اور اس طرح ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت وہ ایک ایسے قبیلہ کو برسر اقتدار لانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے جو خاندان نبوت و رسالت بلکہ خود رسالت و نبوت کا سب سے بڑا حریف قبیلہ تھا۔ اس طرح انھوں نے بنو ہاشم پر اقتدار کی راہیں مسدود کرنے بنی امیہ کے لیئے حکومت پر قبضہ جمانے اور عثمانؓ بن عفان کی خلافت کے لیئے فضا سازگار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

حیرت ناک واقعہ

حضرت عثمانؓ کا خلیفہ بننا تاریخ اسلامی کا وہ حیرت ناک واقعہ ہے جس کی کوئی معقول توجیہ آج تک نہ کوئی موافق کر سکا ہے نہ مخالف، چوہتر برس کے اس بوڑھے سرمایہ

دار کو ایک خاص سازش کے تحت خلیفہ منتخب کیا گیا۔ حالانکہ خلافت کے منصب بلند کے لیئے صحابہ میں انسے موزوں تر شخصیتیں موجود تھیں۔ ان حضرت کی تنگ مزاجی کا یہ عالم تھا حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی نے انھیں ایک مرتبہ کسی بات پر ٹوک دیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے اور اپنے خاندان کے چند غنڈوں کے ذریعہ انھیں اس قدر پٹوایا کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ عثمانؓ نے برسر اقتدار آتے ہی اپنے قبیلہ کے افراد کو مملکت برسر اسلامیہ کے بڑے بڑے صوبوں کا گورنر مقرر کیا اور اس خبیث انسان کو جسے لسان نبوت وحی۔

وزغ ابن وزغ و ملعون ابن ملعون
چھپکلی کی اولاد چھپکلی اور ملعون باپ کا ملعون بیٹا۔

قرار دے چکی تھی اپنا وزیر اعظم اور مشیر خاص نامزد فرمایا۔ ہماری مراد بن الحکم سے ہے جو خلیفہ موصوف کا نہایت قریبی رشتہ دار تھا۔ عثمانؓ بن عفان پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلامی سلطنت کو بنی امیہ کی سلطنت میں تبدیل کرنے کا ایک واضح منصوبہ تیار کیا اور بنو ہاشم کے شرف وجہ پر پانی پھیرنے کی منظم سازش کی۔

محمد کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کی مسند خلافت پر بیٹھ کر اگر عثمانؓ بن عفان اقربا نوازی کریں اور مروان بن الحکم جیسے بدقماش و دوں نہاد انسان کو اپنا وزیر اور مقرب خصوصی بنالیں تو مجال دم زدن نہیں کیونکہ ذوی القربیٰ (قریبی رشتہ کے ساتھ حسن سلوک تو عین اسلام ہے) اور اگر معاملہ آل محمد کا ہو تو محمد کے ذوی القربیٰ کو انکے جائز حقوق سے محروم کر دینا بھی عین اسلام کا تقاضا ہے کیونکہ اگر ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی گئی تو لوگ کیا کہیں گے کہ پناہ بخدا محمد اقربا نواز اور خویش پرور تھے۔

ازاں حساب تو ہر دم تفاوتے دارد　　　کہ قد سرو نہ بینی و سایہ پیمائی

معاویہ، یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیں اور اپنی زندگی ہی میں لوگوں کو اس کی بیعت پر مجبور کریں تو کیا مضائقہ ہے اسے آپ زیادہ سے زیادہ اجتہادی غلطی کہہ لیجئے۔

اس سے اگر بڑھو تو شکایت کی بات ہے

لیکن اگر سیّدہ فاطمہؑ اپنے باپ کی میراث طلب کریں تو یہ سراسر غیر اسلامی مطالبہ تھا اس لیئے خلیفہ وقت اس مطالبہ کو ٹھکرانے میں بالکل حق بجانب تھے۔ ع

تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

شریعت کیا ہوئی موم کی ناک ہوئی، جدھر چاہا گھما لی طاقتور کے ہاتھ میں یہی شریعت ایک بے بس کھلونا بن جاتی ہے اور کمزوروں کے حق میں اس کا جبر و قہر مانی قوت کا مظہر بن جاتا ہے۔

یہ لوگ بھی عجیب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کرلیا سحر آہن بنا دیا

ایک بات ہو تو اس کا ذکر کیا جائے اور ایک صدمہ ہو تو اسکے ماتم سے فارغ ہوں۔ یہاں تو پوری اسلامی تاریخ ہی ایسے حادثوں سے بھری پڑی ہے۔ شکایت کریں تو کیا اور شکوہ کریں تو کس سے؟

ایک ملعون اصطلاح

قران مقدس نے کہا تھا:

لیس با ما نیکم ولا امانی اهل الکتاب ومن یعمل سوء یجز به

تمہاری اور اہل کتاب کی خواہشات کے مطابق فیصلہ نہیں ہوگا۔ جو شخص بھی کسی برائی کا

ارتکاب کریگا اسے اس کا بدلہ مل کر رہے گا۔

لیکن ہمارے علماء و فقہا اور محدثین و مفسرین نے یک زبان ہو کر کہا کہ قران کی بات اپنی جگہ درست ہے مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ سے اگر کوئی برائی سرزد ہو تو اسے برائی نہیں کہیں گے بلکہ اُسے اجتہادی غلطی کہا جائیگا اور یہ اجتہادی غلطی تو بڑی خوبی کی بات ہے اور خدا کو اتنی بھلی لگتی ہے غلط کار مجتہد اس کے یہاں اجر وثواب کا مستحق بن جاتا ہے آخر جس شخص نے اجتہاد میں ٹھوکر کھائی اس کی یہ اہمیت کچھ کم قابل داد ہے کہ اس نے اجتہاد تو کیا۔ باقی رہا غلطی کا معاملہ تو غلطی سے کون بچ سکا ہے۔

یہ اجتہادی غلطی ایک ایسی ملعون اصطلاح ہے جس نے ہر گناہ کو نیکی اور ہر برائی کو بھلائی کا روپ دے دیا اور ہر بدنیت اور بدکار شخص نے اس اصطلاح کی آڑ لے کر ان تمام خباثتوں کا ارتکاب کیا جن سے اسلام کی روح کانپ جاتی ہے۔

خلیفہ برحق کے خلاف خروج و بغاوت گناہ کبیرہ ہے اور گناہ کبیرہ پر اصرار کفر وارتداد ہے لیکن اگر اس کفر وارتداد کا ظہور معاویہ بن ابی سفیان کی جانب سے ہو تو یہ اجتہادی غلطی کہلائے گی۔

علی ابن ابی طالبؑ کرم اللہ وجہٗ کی خلافت برحق ہے لیکن اگر صحابہ کا ایک گروہ ان کے خلاف معاندانہ روش اختیار کرے تو نوبت خون خرابہ تک پہنچ جائے سیکڑوں مسلمان شہید ہو جائیں۔ ہزاروں خاندان تباہی کا شکار ہو جائیں تو حرف شکایت زبان پر مت لاؤ کیونکہ یہ سب کچھ اجتہادی غلطی کی بدولت ہوا اور اجتہادی غلطی پر خدا کے یہاں کوئی گرفت نہیں ہے بلکہ اجر وثواب کی یقین دہانی موجود ہے۔

ان دماغ سوختگان عقل و دانش کو اتنی موٹی سی بات بھی معلوم نہیں کہ اجتہادی غلطی کا

تعلق فکری اور نظری مسائل سے ہوتا ہے جب اعمال میں غلطی رونما ہو اور بار بار ہو تو اسلام کی اصطلاح میں اسے فسق و فجور اور گناہ و معصیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس گناہ و معصیت کا مرتکب خواہ کوئی صحابی ہو یا غیر صحابی، یکساں طور پر مستحق تعزیر ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فقہ حنفیہ کے بہت بڑے عالم گزرے ہیں۔ انھوں نے قران کی ایک عدد تفسیر بھی تصنیف فرمائی ہے وہ اپنی مشہور کتاب "لابد منہ" میں رقم طراز ہیں:۔

"اگرچہ ہر کہ با علیؓ منازعت کرد غلطی است لیکن سوء ظن با صحابہ نہ باید کرد و مشاجرات و منازعات آنہا را ابعمل نیک فرو باید کرد۔"

"اگرچہ جس کسی نے بھی حضرت علیؓ کے ساتھ لڑائی جھگڑا کیا وہ غلطی پر ہے لیکن صحابہ کے بارے میں بدگمانی نہیں کرنی چاہیئے اور ان کے آپس کے جھگڑوں قضیوں کو عمل نیک پر محمول کرنا چاہیئے"۔ اچھا صاحب! تسلیم ہے کہ صحابہ کے بارے میں سوء ظن ناروا ہے لیکن علیؓ ابن ابی طالبؑ کے مقابلہ میں معاویہ کا کردار کوئی ظنی چیز تو نہیں ہے کہ بدگمانی کی گنجائش ہو، یہاں تو واقعات و حقائق کا ایک انبار ہے جو قدم قدم پر فریقین کے طرز عمل کی شہادت دے رہا ہے اور معاویہ کی غلط روش کو نمایاں کر رہا ہے اس کردار کے لیئے عمل نیک کہاں سے فراہم کیا جائے۔ اور بدگمانی سے بچنے کی کون سی راہ تلاش کی جائے؟ بہر حال ابوبکرؓ و عمرؓ ہوں یا عثمانؓ و معاویہؓ یا کوئی دوسری شخصیت محض صحابیت کا شرف کسی انسان کو قانون سے بالاتر نہیں کرسکتا۔ شرف صحابیت کے ضمن میں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ "ہر صحابی پاکباز اور نیک ہوتا ہے اور اس لیئے نجات یافتہ اور مرحوم و مغفور ہے" یہ عجیب و غریب اصول نہ جانے کہاں سے گھڑ لیا گیا کہ محض صحابی رسولؐ ہونا نجات اُخروی کا ضامن ہے اور ایک صحابی کو یہ تحفظ کہاں سے مل گیا کہ وہ اس اعزاز کی بنا پر جرموں کی پاداش سے بچ جائیگا۔

اور خدا کے قانون عدل کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں اس قسم کے کسی حقوق یافتہ طبقہ کا کوئی وجود نہیں ہے اور اسلام کا اپنا مزاج ہرگز اس امتیاز کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ جس کتاب مقدس میں خود پیغمبر تک سے یہ کہہ دیا گیا ہو کہ۔

"قل لا ادری ما یفعل بی و لا بکم" آپ کہہ دیجیے کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے۔

اس کی رو سے یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی ایسے شخص کو جسکی پوری زندگی کے خلاف بغاوت میں گزری پروانۂ مغفرت عطا کردیا جائے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

کبرت کلمة تخرج من افواههم ان یقولون الا کذبا

حضورؐ کے صحابہ بے شک قابل احترام اور لائق صد تکریم ہیں لیکن ہر وہ شخص جس نے ایمان کی حالت میں حضورؐ کو دیکھا ہو وہ شرف صحابیت سے مشرف نہیں ہوسکتا۔

یہ مفہوم نہ از روئے لغت عرب صحیح ہے نہ از روئے شرع، دور بنی امیہ و بنی عباس کے خود فراموش فقہا نے اگر کچھ اصطلاحیں وضع کر لی ہیں تو ہم اسکے پابند نہیں ہیں کہ انھیں درست مان لیں نہ ہر کس و ناکس پر صحابی کا اطلاق موزوں ہے۔ (تلویح بسم الدین تفتازانی مطبوعہ مصر)

جن نفوسِ قدسیہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں دیکھی تھیں اور جن کی زندگی کا یہ انداز مرتے دم تک قائم رہا۔ جنھوں نے حضورؐ کے وصال کے بعد آپ کے ارشادات و فرامین اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو حرز جان بنا کر رکھا جو آپ کی اتباع کو سرمایۂ حیات سمجھتے رہے اور ہمیشہ اس راہ پر گامزن رہے، جس کے خطوط خود حضورؐ نے متعین فرمائے تھے جو

نہ کبھی وقت کے ساتھ بہے نہ وقتی اور ہنگامی مصلحتوں اور دنیاوی منطقوں نے ان کے پائے عزیمت و استقامت میں کوئی لغزش پیدا کی۔ بلاشبہ ایسے لوگ اس کائنات میں سب سے زیادہ عزت و عظمت کے مستحق ہیں اور ان کا اجر اللہ کے یہاں محفوظ ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوعنہ، لیکن جن لوگوں نے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو فراموش کر کے دنیا اور اسکی لذتوں کے حصول کو اپنا دلپسند مشغلہ بنایا۔ عیش و عشرت کی ہنگامہ آرائیوں میں مبتلا ہو کر سنت نبوی سے منحرف ہوگئے اور تقویٰ و اطاعت کے جادۂ مستقیم سے دور جا پڑے۔ ان کے لیئے اجر و انعام کا وعدہ باقی نہیں رہا وہ بہر حال اپنی سزا کو پہونچیں گے اور کیفر کردار سے بچ نہیں سکیں گے کہ آئین و دستور خداوندی یہی ہے۔

ولن تجد لسنّت الله تبدیلا ۔ اور تم خدا کی عادت کو بدلتے نہیں دیکھو گے۔

بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

"یرد یوم القیامة رهط من اصحابی فیخلون عن الحوض فاقول یا ربّ اصحابی ! فیقال لاعلم لك بما احدثوا بعدك انهم ارتدو"۔

"فقول سحقاً سحقاً لمن غیر بعدی"

میرے صحابہ کا ایک گروہ قیامت کے دن میرے سامنے آئے گا۔ انھیں حوض کوثر سے ہٹا دیا جائیگا۔ میں عرض کروں گا خدایا یہ میرے صحابی ہیں جواب آئے گا کہ تمھیں خبر نہیں کہ تمہارے ساتھ انھوں نے کیا کیا یہ اپنے قول و اقرار سے پھر گئے تھے تب میں کہوں گا کہ جس نے میرے بعد میرے راستے سے انحراف کیا ہے اسے مجھ سے دور لے جاؤ۔

(بخاری کتاب الرقاق، ص ۳۷، سطر ۵، مطبوعہ ممبئی)

نیک نفس اور پاک باطن صحابہ قابل احترام ضرور ہیں لیکن معیارِ حق وہ نہیں ہے بلکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے حضورؐ کے علاوہ کوئی شخصیت نہ معیارِ حق ہے نہ اُس کا کوئی قول و فعل حجت بن سکتا ہے۔ اسلام نے اس باب میں اس قدر احتیاط برتی ہے کہ پیغمبر کی اطاعت کے لئے بھی معروف کو شرط لازم قرار دیا گیا ہے حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ جب کسی شخص سے بیعت لیتے تو فرماتے" الطاعۃ فی معروف " تم پر میری اطاعت معروف کی حد تک واجب ہوگی (تاج)

لیکن ہماری بدقسمتی کا یہ عالم ہے کہ ہم نے ایک حضورؐ کی ذات کو چھوڑ کر باقی سب کو حق و عدل کا معیار قرار دے لیا اور شخصیت پرستی کی لعنت میں اس حد تک مبتلا ہو گئے کہ جہاں کہیں واقعات و شواہد اور نصوص قطعیہ موجود ہوں وہاں بھی ہماری نظر سب سے پہلے کسی ایسی شخصیت کی طرف اٹھتی ہے جو ہماری عقیدتوں کا مرکز ہو اور ہم سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی رائے اس بارے میں کیا ہے اور وہ اس معاملہ میں کیا موقف رکھتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی تھا:-

" دُوْرُوْا مَعَ الْکِتَابِ حَیْثُ دَارَ " "جس سمت کتاب الٰہی کا رخ ہو اسی سمت گھوم جاؤ" یعنی قانون الٰہی کو مرکزی نقطہ قرار دے کر خود اس کے مطابق چلو لیکن ہم یا تو ہوا کے رخ پر چلنے کے عادی ہیں "یا جس کی لاٹھی اسکی بھینس" ہمارا معمول ہے اور اندھا دھند تقلید کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔

مشہور محدث ابن جوزی نے اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں اس روش سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"واعلم ان عموم اصحاب المذاهب يعظم في قلوبهم

الشخص فيتبعون قوله من غير تدبر بما قال وهذا عين الضلال لان النظر ينبغى ان يكون الى القول لا الى القائل كما قال على عليه السلام لحارث بن حوط قد قال الا تظن ان طلحة والزبير كانا على باطل فقال لا يا حارث انه ملبوس عليك ان الحق لا يعرف بالرجال، اعرف الحق تعرف اهله".

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اصحاب مذاہب کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ جس کے معتقد ہوئے اس کی بات کو بے سوچے سمجھے قبول کر لیتے ہیں اور یہ صریحاً گمراہی ہے کیوں کہ قائل سے زیادہ قول پر نظر رکھنی چاہیے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے حارث بن حوط کے بات کے جواب میں کہ آپ کا خیال کیا ہے ہم طلحہ و زبیر کو غلطی پر سمجھنے لگیں؟ یہ فرمایا تھا کہ حارث! تمہیں دھوکا ہوا ہے یاد رکھو حق انسانوں کے ذریعہ نہیں پہچانا جاتا بلکہ حق کے ذریعہ اہل حق پہچانے جاتے ہیں (البیان والتبیین)

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

مسلمانوں کے افکار و عقائد و افکار اور نظریات و اعمال کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ دنیا کی ہر زوال پذیر قوم کی طرح ان کے سوچنے کا ڈھنگ اور اُن کے عمل کا اسلوب بھی ضابطہ عقل و دانش، قانون قدرت اور آئین فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ دنیا جہان کی بھلائیاں ان کے کشکول گدائی میں موجود ہیں۔ اور ہر برائی اور خرابی ان کے دامن میں پناہ لے کر خوبی و رعنائی کا روپ دھار لیتی ہے۔ ع

بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

یہودیوں نے کہا تھا: "نحن ابناء الله و احبائوہ" ہم اللہ کے بیٹے اور ہم اللہ کے پیارے ہیں۔

یہی دعویٰ آج اٹھتے بیٹھتے مسلمانوں کے نوک زبان پر ہے خدا نے ان کو ہسپانیہ کے مرغزاروں سے ذلیل وخوار کر کے نکالا لیکن ان کی شان محبوبیت میں فرق نہیں آیا۔ خدا نے ان کو صلیبی جنگوں کے ہزار صد سالہ خطرناک دشمن کی چیرہ دستیوں کا نخچیر بنا دیا۔ لیکن یہ پھر بھی "خیر اُمتِہ" (بہترین امت) کا طغرائے امتیاز گلے میں ڈال کر دندناتے پھر رہے ہیں انکی سلطنتوں کا شیرازہ درہم برہم کر دیا گیا، ذلت وشکست ان پر طاری کر دی گئی اور دنیا کی حقیر قومیں ان کے ساتھ وہ کھیل کھیلنے لگیں جو بلی چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے مگر انکی آن میں فرق نہیں آنے پایا۔ ع

یارما ایں دارد و آں نیز ہم

مسلمانوں کا سب سے بڑا ہتھیار نعرۂ تکبیر ہے۔ ہلاکو خاں نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی مگر ان کے نعرۂ تکبیر کی گھن گرج قائم رہی بنی اسرائیل کے لیئے تو ایک ہی نجت نصر کافی ہو گیا تھا مگر ان کی ضیافت طبع کے لیئے بے شمار بخت نصر اٹھے جنھوں نے دل کھول کر ان کی عزت وآبرو لوٹی مگر صاحب نہ جانے کس مٹی بنے ہوئے ہیں یہ لوگ اور پتہ نہیں کس گارے سے ان کی فطرت کا خمیر اٹھا ہے کہ ان کے دم خم بدستور قائم ہیں۔

شکست کھا کر خود کو فاتح سمجھنا اور پٹ کر بھی احساس فتح مندی کے نشہ میں بدمست رہنا خدا کے ان لاڈلوں کی خاص ادا ہے زیاں کاری میں سود مندی کا سرور اور محکومیت کو محبوبیت کا رنگ دینا کوئی ان حرماں نصیبوں سے سیکھے کیا سکندر کا نصیب ان لوگوں نے پایا ہے اور کیا نجت جوان ان کے حصہ میں آیا ہے۔

بہیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم
شہان بے کمر وخسروان بے کلہ اند

کسی قوم کی فطرت اس قدر مسخ نہیں ہوئی ہوگی جتنی مسلمان قوم کی ہو چکی ہے اور شاید ہی کبھی کسی قوم کے ساتھ قدرت نے ایسا ہولناک سلوک کیا ہوگا۔ جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہوا دنیا میں یہی ایک قوم ہے جس نے اپنے عظیم المرتبت پیغمبرؐ کی آنکھیں بند ہوتے ہی ایسے ایسے ڈرامے کھیلے کہ تاریخ آج تک سرگرداں ہے کہ وہ ان داستانوں کو اس قوم کے محاسن کی فہرست میں رکھے یا اس کی بدفطرتی کو ان ڈراموں کا عنوان بنائے۔

بنی اسرائیل نے انبیا کو قتل کیا ٹھیک ہے مگر چھاج تو بولے چھلنی کیوں بولے جس میں سو چھید کیا مسلمانوں نے بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چلنے اور انکی سنت کو زندہ رکھنے میں کچھ کم دقیقہ فروگذاشت کیا ہے علی ابن ابیطالب ہوں یا حسین ابن علی ان کی احسان فراموشی محسن کشی اور انصاف ناشناسی کا ہر باب اپنی جگہ مکمل ہے۔

پیغمبرؐ نے کہا تھا ظالم وجابر حکمراں کے منھ پر کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے لیکن جب اس جہاد کا ایک مرد میدان دشت کربلا میں پہنچا تو یکا یک اس اُمت پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اگر کوئی حکمراں اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ظلم وستم کا بازار گرم کرے تو اس سے تعرض کرنا جہاد نہیں فساد فی الارض ہے اور فتنہ وفساد برپا کرنا تو غیر اسلامی حرکت ہے

ناطقہ سربہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس اپنا کوئی مستقل فلسفہ افکار واخلاق نہیں ہے لوگ کہتے ہیں تو جھک مارتے ہیں۔ مسلمانوں کے فلسفہ اخلاق کا منھ بولتا ثبوت دشت کربلا ہے اور اُن کے فلسفہ افکار کا عکس جمیل وہ لٹریچر ہے۔ جس میں اُنھوں نے مستند حکمرانوں کو اور سامراجی خداؤں

کی مدح سرائی کی ہے۔

آج معاویہ ویزید کی منقبت میں جو کتابیں لکھی جارہی ہیں اور خاندان بنی امیہ کی تعریف میں زمین وآسمان کے جو قلابے ملائے جارہے ہیں وہ مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ روایات کا لازمی ردعمل اور اُن کے فلسفۂ اخلاق وافکار کا ایک ناگزیر تقاضا ہے اس پر تعجب کیوں ہو۔؟ بڑے بڑے ناموراماموں نے جن میں ابن تیمیہ اور غزالی جیسے لوگ شامل ہیں ظالم کی حمایت اور مظلوم کی مذمت کا کارنامہ بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے اور گو روشن خیالی جمہوریت اور تہذیبی ارتقا کے اس دور میں یہ کیسا انوکھا واقعہ کیوں نہ ہو لیکن مسلمانوں کی تو پوری تاریخ ایسے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ جو قوم امام حسین کے قاتلوں کو جنم دے سکتی ہے کیا وہ یزید اور اُس کے باپ کی تعریف میں رطب اللسان نہیں ہو سکتی ؟ ع

قیاس کن زگلستان بہار مرا

اسلامی سیاست کے آداب

اسلامی تعلیمات سے جو لوگ واقف ہیں اُنھیں یہ بتانے کی چنداں حاجت نہیں ہے کہ اسلامی سیاست کا خمیر شرافت کی پاکیزہ مٹی سے تیار ہوتا ہے۔ مکارم اخلاق کی پاس داری اسلامی سیاست کا وہ طرۂ امتیاز ہے جس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ حق وانصاف، صدق، وراست بازی، دیانت وامانت، انکسار وتواضع، عدل ومساوات، شفقت وہمدردی، عفو رحم اور تقویٰ وطہارت، یہ وہ امتیازی خصوصیات ہیں جنکے بغیر اسلامی سیاست کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا مکر وفریب طبقاتی امتیاز، رشوت ستانی اور ظلم وجور، عہد شکنی سیاسی جوڑ توڑ خویش پروری اقربا نوازی اور اسی قبیل کی دیگر خرافات اسلامی سیاست کی رو سے قطعاً ناروا بلکہ ناقابل

برداشت ہیں۔ خاندان بنی امیہ کی حکومت اور اس کے ساتھ ساتھ دور اقتدار میں اسلامی قدروں کی جس بری طرح پامالی ہوئی اور اسلام کے انقلاب آفریں نظریات کو جس حد تک ضعف ونقصان پہنچا اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمیں اسلامی تعلیمات کا ٹھیک ٹھیک علم وادراک ہو اور ہمیں خبر ہو کہ اسلام کا وہ خصوصی مزاج کیا ہے جو اسے دیگر تمام ادیان وملل سے الگ تھلگ اور ممتاز ومنفرد قرار دیتا ہے۔ آخر وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اُسے انسانیت کا نجات دہندہ مذہب قرار دیا جاتا ہے۔

اسلام کا ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے ایک نظام زندگی ہے، ایک لائحہ عمل ہے ایک جامع پروگرام اور ایک انقلاب آفریں منشور ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے مسئلہ سیاست ہو یا معیشت تجارت ہو یا اقتصاد صلح ہو یا جنگ انفرادی معاملات ہوں یا اجتماعی مسائل اسلام ان تمام امور میں عدل ومساوات کے ایک نئے اسلوب کا داعی ونقیب ہے اور جب تک یہ اسلوب ہمارے پیش نظر نہیں ہوگا ہم بنی امیہ کی ترک تازیوں اور چیرہ دستیوں سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکتے۔

اسلام اور نظام سرمایہ داری، اسلام اور فریب کارانہ سیاست، اسلام اور تصور ملوکیت اسلام اور جبر واستبداد اسلام اور استحصال دو متضاد راہیں ہیں کوئی شخص بیک وقت ان دونوں راہوں کا مسافر نہیں بن سکتا جب کہ بنی امیہ کے یہاں سرمایہ دارانہ طور طریقوں، فریب کارانہ سیاسی بدقماشیوں، شاہانہ کروفر، جبر واستبداد اور استحصالی تمام قباحتیں تمام وکمال موجود تھیں اور سیاسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ خاندان بنی امیہ اور اسلام دو متضاد چیزیں ہیں جیسے رات دن مشرق ومغرب،

سرت مشرقا سرت مغربا

شتاں ہیں مشرق ومغرب

ان دونوں کی محبت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتی اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ وہ اسلام کا سچا وفادار ثابت ہو تو اُسے بنی امیہ کے نام نہاد خلفاء سے دست کش ہونا پڑے گا حاشا وکلا مجھے کسی قبیلہ یا گروہ سے کوئی ذاتی کد نہیں نہ کسی خاندان کو صرف اس لئے مطعون اور مورد الزام قرار دے رہا ہوں کہ وہ خانوادہ رسالت سے برسرپیکار رہا ہے۔ اگرچہ یہ جرم بھی کچھ کم سنگین نہیں ہے تاہم شخصیتوں اور گروہوں کے باہمی تصادم کو سردست نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن اصول ونظریات کی باہمی آویزش میں حق وباطل کا پاس رکھنا ضروری ہے۔

عثمان بن عفان، معاویہ بن ابی سفیان، یزید پلید مروان اور اُس کی ذریت کے بارے میں دیانت دارانہ رائے اور تاریخ کا غیر جانب دارانہ فیصلہ بھی یہی ہے اور تاریخ کا ہر طالب علم بھی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان لوگوں نے اپنے عہد اقتدار میں وہ سب کچھ کیا جس سے اسلام کی عالمگیر اور انقلاب انگیز تحریک کمزور پڑ گئی۔ اسلام کے بنیادی اصول بُری طرح پامال ہو کر رہ گئے اور اس کا سارا فلسفہ اخلاق وسیاست سبوتاژ کر دیا گیا۔

جہاں تک دور بنی امیہ کی فتوحات کا معاملہ ہے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ فتوحات اسلام کی اُبھرتی ہوئی تحریک کا منطقی نتیجہ تھیں، اگر ان کے بجائے کوئی اور قبیلہ برسر اقتدار ہوتا جب بھی اُس کی رفتار کا یہی عالم ہوتا اس میں بنی امیہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ لیکن خدارا کوئی بتائے کہ یہ کیسی اسلامی حکومت تھی جس نے بلاشبہ افریقہ، یورپ اور وسط ایشیا تک یلغار کی مگر جس کی اپنی حدود سلطنت میں عوام ظلم وستم کی چکی میں پس رہے تھے۔ جس نے انفرادی اور اجتماعی آزادیوں کا گلا گھونٹ دیا جس کے جبر واستبداد کے ہاتھوں حرم کعبہ تک محفوظ نہ رہا

اس کی چیرہ دستیوں نے مدینۃ الرسول کی عزت وناموس کو لوٹا اور جس نے لاکھوں بے گناہوں کو تہ تیغ کر دیا اور اس ظلم واستبداد کے ساتھ یہ لوگ ایک عالم کو مسلمان بنانے نکلے تھے اور دنیا میں اسلام پھیلانا ان کا مطمح نظر تھا۔

تو درون در چہ کردی کہ برون خانہ آئی

اوّلین اُفتاد

عثمان بن عفان کی خلافت اوّلین افتاد ہے جس نے اسلام کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا اور اسلام کے نظام مملکت وحکومت میں وہ دور رس توڑ تبدیلیاں پیدا کر دیں کہ اسلام کا وہ عظیم انسان اور انقلاب انگیز مشن جو نسل انسانی کو ہر قسم کے استحصال واستبداد سے نجات دلانے کا علمبردار تھا، یکسر ناکام ہو کر رہ گیا اور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام کو پھلنے اور پھولنے اور ترقی کرنے کے بہترین مواقع میسر آئے حالانکہ اسلام سرے سے نظام سرمایہ داری کا قائل ہی نہیں بلکہ اُسکے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ سرمایہ دارانہ طور طریقوں اور اس کی مختلف صورتوں اور شکلوں کو دنیا سے مٹا دے ان زنجیروں کو ایک ایک کر کے توڑ دے جن میں انسان صدیوں سے جکڑا ہوا کراہ رہا تھا:۔

"یضع عنهم اصرهم والا غلال التی کانت علیهم"

(پارہ ۹ سورہ ۷ آیت ۱۵۷ الاعراف ۲ طبقات ابن سعد ۳ اصابہ۔ اسد الغابہ۔ بخاری ۔ استیعاب۔ مسلم، طبری، از مناظر احسن گیلانی ص ۲۲۰)

لیکن یہ کیسا سنگین حادثہ تھا جو اسلام پر گذرا کہ اسلامی مملکت کی باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں چلی گئی جس کا اپنا مزاج اسلام سے ہم آہنگ نہ تھا اور جو دل وجان سے نظام

سرمایہ داری کا حامی اور محافظ تھا۔

حضرت عثمانؓ بن عفان کا دورِ حکومت نہ صرف اسلامی نقطۂ نگاہ سے بلکہ آج کے مروجہ جمہوری اصول کی رو سے چنداں خوشگوار نہ تھا ظلم و زیادتی، ملکی خزانہ کا ناجائز استعمال، ذہن و ضمیر پر پابندی، حق و انصاف پر قدغن، سازش، فریب، سیاسی رشوت، خویش پروری، اقربا نوازی، سیہ کاری اور اسی نوع کی دیگر تمام مذموم حرکتیں اس دور کا طغرائے امتیاز ہیں کہ ان کی توقع اسلامی مملکت اور نظامِ خلافت سے تو الگ رہی عام حکومتوں سے بھی نہیں کی جا سکتی اسلامی ریاست کے کلیدی مناصب پر اپنے قریبی رشتہ داروں کو متعین کرنے کی جس پالیسی کو حضرت عثمانؓ بن عفان نے اختیار کیا اور جسکے ثبوت میں بہ کثرت تاریخی شہادتیں موجود ہیں نہ صرف یہ کہ اسلام کے خلاف تھی بلکہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی آئینہ دار بھی تھی۔ اس حکومت عملی نے اسلام کے پورے ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ یہی وہ دور تھا جب طالع آزماؤں کو کھل کر کھیلنے کا موقع ملا اور صحبتِ نبوی کے فیضیاب حضرات پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔

اس ضمن میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جو پیغمبرؐ کے ارشاد کے مطابق اپنے عہد کا سب سے بڑا راست باز انسان تھا مگر جسے محض جرمِ حق گوئی کی پاداش میں دیارِ حبیب مدینۃ المنورہ کو چھوڑ کر جلا وطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی اور ابوذر غفاریؓ کو ربذہ کے علاقہ میں نظر بند کر دیا گیا ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ سرمایہ داری کے خلاف سرعام تبلیغ کرتے تھے۔

کیا اسلام ایک اصولی تحریک ہے؟

کسی اصولی اور منظم تحریک کے بارے میں کبھی یہ بات سننے میں نہیں آئی کہ اس کا سربراہ ایک ایسا شخص بنا دیا گیا ہو جس کی واحد خصوصیت یہ تھی کہ وہ سرمایہ دار تھا اور اس کے پاس بے پناہ دولت و ثروت تھی۔

ہم نے اپنے زمانہ قریب میں ہندوستان کی تحریک آزادی کی تفصیلات دیکھی اور سنی ہیں۔ ہر قسم کے لوگ شامل تھے ان میں زبردست ادیب اور عالم بھی تھے، نامور فلسفی اور دانشور بھی تھے بڑے سیاست داں اور جذباتی قسم کے نوجوان بھی تھے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی پشت پناہی بھی اس تحریک کو حاصل تھی۔ ہندوستان کا ارب پتی سرمایہ دار سیٹھ برلا بھی اس تحریک کا ہمنوا تھا اور اس نے تحریک آزمائی میں لاکھوں روپے دان دیئے اور ہر آڑے وقت میں کانگرس کی امداد بھی کرتا رہا۔ مگر کانگرس ہائی کمان کے حاشیہ خیال میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ برلا یا اسی قماش کے کسی دوسرے شخص کو ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا جائے اور اس کی اس مالی امداد کے صلے میں صدارت یا وزارتِ عظمیٰ کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا جائے۔ یہ حال تو خالصتاً ایک ایسی تحریک کا تھا جس کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن چونکہ کانگرس ایک اصولی اور منظم جماعت تھی اس لیئے لاکھوں روپیہ اس نے دان دینے والوں کو ان رہنماؤں کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دی جو آزادی کی جنگ میں عملی حصہ لیتے رہے جنھوں نے جیلیں کاٹی تھیں۔ مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ دکھ جھیلے، ایثار قربانی کی روایات قائم کی تھیں اور اپنا سب کچھ تج کر اس تحریک کی قیادت کی تھی۔ مگر اسلام کی تحریک جو ایک خالص روحانی تحریک تھی اس میں یہ کیسی عجوبہ زائی ہے کہ قیادت و امارت کا تاج ایک ایسے شخص

کے سر پر رکھ دیا گیا جس کی حیثیت عہدِ رسالت میں محض ایک سرمایہ دار تاجر کی تھی اور جس کی واحد امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی لاکھوں کی آمدنی سے دس بیس ہزار روپے اسلام کے نام پر صرف کر دیتا تھا جس نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ کسی معرکہ میں اسے حضورؐ کی صحبت میں رہنے کا موقع نہیں ملا۔ جو کبھی مردِ میدان نہیں رہا، جسے اپنی پوری زندگی میں اسلام کی عظمت و ناموس کے تحفظ کے لیے تلوار اٹھانے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی نہ وہ اصحاب بدر میں سے تھا نہ غزوۂ احد کے مجاہدین میں اس کا نام ملتا ہے نہ بعد کی کسی جنگ میں اس کی شرکت و شمولیت ثابت ہے اچانک حضرت عمرؓ قتل کر دیے جاتے ہیں اور اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر عبدالرحمان ابن عوف نے جو خود ایک کروڑ پتی سرمایہ دار تھا اور عثمان بن عفان کا بہنوئی بھی در پردہ ایسی پخت و پز کی کہ قرعۂ فال حضرت عثمانؓ کے نام نکل آیا اور مملکت اسلامیہ کی زمام کار ایک ایسے شخص کے ہاتھ آ گئی جس کا عمر بھر کا مشغلہ لین دین، بھاؤ تاؤ اور بہی کھاتوں کی دیکھ بھال کے سوا کچھ نہ تھا۔

بیعت رضوان اور ذوالنورین

حضرت عثمانؓ کی خصلت کے باب میں بیعت رضوان کا واقعہ بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے حالانکہ اس میں حضرت عثمان کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اگر ان کے بجائے کوئی دوسرا معمولی شخص بھی سفارتی مشن پر گیا ہوتا اور اس کے قتل کی افواہ گرم ہوتی تو بلاشبہ حضورؐ کا ردعمل وہی ہوتا جو حضرت عثمانؓ کے معاملہ میں ہوا۔ باقی رہا انکے سفیر بنائے جانے کا مسئلہ تو یہاں فضیلت و عظمت کا کوئی اضافی پہلو نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں مین وہی ایک ایسے شخص تھے جن کی تجارتی روابط مشرکین مکہ کے ساتھ استوار تھے نمایندگی کے لیے حضرت عثمان

[illegible] کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مکہ کی سرداری ان کے قرابتداروں کے ہاتھ میں تھی اس لیے ان کے ہلاک ہونے یا مارے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ابوسفیان جو قریش کا سردار تھا آپ کے قبیلہ کا ایک فرد اور آپ کا ابن عم تھا۔ یہ تھیں وہ مصلحتیں جن کی بنا پر حضرت عثمان کو سفیر بنا کر بھیجا گیا۔

بنی امیہ کے عہد سلطنت کے مؤرخوں اور وقائع نگاروں نے حضور نبی اکرمؐ کے حوالے سے حضرت عثمانؓ کے لیے ''ذوالنورین'' کا ایک خود ساختہ خطاب ایجاد کر کے انکی [illegible] عظمت کو بحال کرنے کی سعی ناکام کی ہے۔ اس ''ایجاد بندہ'' کا پس منظر یہ بتاتا ہے کہ حضورؐ نے اپنی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے اُن کے عقد میں دیں اور اُنھیں اپنا داماد ہونے کا شرف بخشا یہ بات نہ صرف حضور کی ذات پر بہتان عظیم ہے بلکہ عربوں کی قومی روایات اور قبائلی نظام کی خصوصیات سے ناواقفیت اور جہالت کی دلیل بھی ہے اور یہ روایت محض اس لئے اختراع کی گئی کہ حضرت علیؑ کے مقابلہ میں افضل و اعلیٰ ثابت کیا جائے بنی امیہ کو اس سے کیا غرض اس سے حضورؐ کی ذات پر کیا حرف آتا ہے اور حضورؐ کی شان کس قدر کم ہوتی ہے۔ العیاذ باللہ ساری دنیا جانتی ہے کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ شروع ہی سے دو حریف قبیلے تھے اور ان میں رقیبانہ کشمکش پورے عروج پر تھی مصلحت خداوندی کا تقاضا تھا کہ بنی ہاشم کے ایک ممتاز فرد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت و رسالت سے سرفراز کیا جائے۔ بنی ہاشم پر اس غیبی انعام و نوازش سے بنی امیہ کے دل میں حسد و رقابت کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور وہ کھلم کھلا دشمنی پر اتر آئے تاریخ سے ایک بھی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی کہ بنی امیہ اور بنی ہاشم میں کبھی رشتہ مصاہرت قائم ہوا الا یہ کہ پہلی مرتبہ ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہؓ حضورؐ کے حرم میں داخل ہوئیں (طبری ج ۳ ۱۱۲۔ اور آپ راہبہ تھیں صرف رسول اللہ سے

شادی کی گئی تھی)

حضرت خدیجہ الکبریٰ کے پہلے دونوں شوہروں کی اولاد میں تین لڑکیاں، زینب، رقیہ، ام کلثوم، حضورؐ کی ربائب تھیں اور ان کی شادیاں حضرت خدیجہ کے قرابت داروں میں طے پائیں، عثمان رشتہ میں حضرت خدیجہ کے بھانجے تھے نا سمجھ لوگ اس سلسلہ میں قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

"یا ایھاالنبی قل لازواجك وبناتك"

اے پیغمبر اپنی بیوی اور بیٹیوں سے کہہ دیجئے۔

کہ چونکہ "بنات" جمع ہے "بنت" کی اور عربی میں جمع کا اطلاق کم از کم تین یا زیادہ پر ہوتا ہے بنا بریں ثابت ہوا کہ حضورؐ کی صاحبزادیاں چار تھیں۔ لیکن یہ لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ "ربائب" پر مجازاً بنات کا اطلاق ہو سکتا ہے جس طرح چچا کے لئے اب (باپ) کا لفظ قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے بلکہ قرآن پاک نے حضرت لوطؑ کا قصہ بیان کرتے ہوئے تمام قوم کی بیٹیوں کو پیغمبر کی جانب منسوب کیا ہے کہ۔

هٰؤلاء بَنَاتِي هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ　　یہ میری بیٹیاں ہیں یہ اس مقصد کے لیئے زیادہ موزوں ہیں یہاں "بناتی سے مراد حضرت لوطؑ کی حقیقی بیٹیاں ہرگز نہیں ہیں۔ (بیان القرآن اشرف علی تھانوی)

بلکہ وہ اپنی قوم کو جو خلاف وضع فطری فعل کی دلدادہ تھی یہ سمجھا رہے ہیں کہ پاکیزہ اور معقول راستہ یہ ہے کہ ہر شخص کے لیئے جائز طور پر لڑکیوں سے ہی جنسی تعلق قائم کیا جائے نہ کہ لڑکوں سے۔ اس اعتبار سے سوتیلی لڑکیوں پر بنات کا لفظ بدرجۂ اولیٰ بولا جاتا ہے۔ (یہ جو کہا جا رہا ہے کہ چونکہ بعض کتب شیعہ میں حضورؐ کی چار صاحبزادیوں کا ذکر آتا ہے

اس لیئے یہ تعداد قطعی اور یقینی ہے تو "غلط العام" صرف لغت ہی میں نہیں ہوتا بلکہ تاریخ میں بھی اس کا وقوع عام ہے بالخصوص جب کہ اس "غلط العام" کی سرکاری سطح پر تشہیر کی گئی ہو تو اس غلطی سے بچنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔)

اور فرض کر لیجیے کہ حضورؐ کے ساتھ حضرت عثمان کا رشتۂ مصاہرت قائم تھا جب بھی ان کی حیثیت مسر نوح کی سی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس دور کے مسلمانوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا اور بالآخر ایک عوامی شورش کے ذریعہ ان کے اقتدار کی بساط الٹ دی گئی اور انھیں باغیوں کے ایک ہجوم نے قتل کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف عوامی ردِ عمل اس قدر شدید تھا کہ تین روز تک انکی میت بے گور و کفن پڑی رہی ان کی لاش کی بے حرمتی کا یہ عالم رہا کہ معتبر روایات کے مطابق قبرستان بقیع میں ان کا جسد بے روح لاوارث پڑا رہا اور ایک روایت کے بموجب انکی ایک ٹانگ کو کتا گھسیٹ لے گیا تین چار دن کے بعد جب عوام کا اشتعال قدرے کم ہوا تو انھیں بڑی رواروی میں بغیر کسی اعزاز و اکرام کے دفن کر دیا گیا۔

کیا عوام کے کسی پسندیدہ حکمراں کا یہ حشر ممکن تھا؟ اور کیا وجہ تھی کہ مدینۃ الرسولؐ کے باشندوں نے انکی مدافعت نہ کی اور اس بے بسی کے عالم میں ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ ان کی موت کا یہ دردناک پہلو اس امر کا غماز ہے کہ ان سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوئیں جو امت محمدیہ کے لیئے بدرجۂ غایت ناخوشگوار اور سخت ناپسندیدہ تھیں۔

قتل عثمان کے محرکات

حضرت عثمانؓ کے خلاف جو ہنگامہ برپا ہوا اس کا سب سے بڑا محرک خود ان کا اپنا طرز عمل تھا اور اس میں ان کی بے تدبیروں کا بڑا دخل ہے ورنہ وہ شاید اس انجام سے دوچار نہ ہوتے۔

انھوں نے بعض ایسی سنتوں کو نظر انداز کیا جن پر لوگ حضورؐ کے زمانہ سے عمل پیرا تھے اور بعض بدعتوں کو رواج دیا اور بعض ایسے ناپسندیدہ عناصر کو اپنا مقرب اور معتمد خاص بننے کا شرف بخشا جنھیں حضور نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ سے باہر دھکیل دیا تھا۔ آپ نے ان بدنہاد لوگوں کو نہ صرف انعام و اکرام سے نوازا بلکہ انھیں خلافت کی ذمہ داریوں میں اپنا شریک و معاون بھی بنایا۔ حضرت عثمان نے اپنے خاندان کے اکثر و بیشتر افراد کو صوبوں کی گورنریاں بخش دیں۔ ("تاریخ اسلام" شاہ معین ندوی ص ۲۵۹ دارالمصنفین اعظم گڑھ)۔ ان گورنروں میں بعض ایسے بدکار قسم کے لوگ بھی تھے جو شراب پی کر نشہ کی حالت میں امامت سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ابن عم ابوسفیان کو بیت المال سے دو لاکھ درہم دلوائے اور اپنی بیٹی عائشہ کے شوہر حارث بن حکم کو ایک لاکھ درہم عطا کیئے، اپنے محلات اور اپنی جاگیروں میں توسیع کی اور اپنے خاندان کے بعض نااہل افراد کو جاگیریں بخشیں اور اسکے مقابلے میں بعض نامور صحابہ کو بیت المال میں ان کے جائز حق سے محروم کر دیا، انھوں نے بعض جلیل القدر صحابہ کو سر عام زدوکوب کیا ان کی بے عزتی اور توھین کی اور کئی نامور صحابہ کو معمولی اختلاف کی بنا پر جلاوطن یا نظر بند کر دیا۔

حضرت عثمان کی اس استبدادانہ روش سے مسلمانوں میں طبقاتی کشمکش کا ظہور ہوا اور

مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں بغض و عداوت اور نفرت و کدورت کی فضا پیدا ہو گئی (العقد الفرید، ج ۲، ص ۳۳۲)

حضرت عثمانؓ کے خلاف جن لوگوں کے جذبات زیادہ مشتعل ہوئے وہ زیادہ تر دور افتادہ علاقوں کے دیہاتی، آزاد شدہ غلام افلاس و غربت کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے مزدور کسان اور کاشتکار تھے۔ یہ اسلامی ریاست کے لوگ شہری ہونے کے باجود ان بنیادی حقوق سے یکسر محروم کر دیئے گئے تھے جو اسلام کی کتاب دستور نے انھیں عطا کیئے تھے بالخصوص دیہاتی قبائل کو حضرت عثمان اور ان کے خاندان والوں سے بجا طور پر یہ گلہ تھا کہ مال غنیمت اور جاہ و منصب میں بنی امیہ کو زیادہ حصہ مل رہا ہے دانشمندی کا یہ تقاضا تھا کہ خلیفۂ وقت ان کی جائز شکایات کا ازالہ کرتا اور ان کے اس تلخ احساس کو زائل کرنے کی ہر ممکن تدبیر بروے کار لاتا لیکن اس کے برعکس حضرت عثمانؓ نے ان کی کسی بات کو در خور اعتنا نہ سمجھا اور ان کے کسی مطالبہ کا نوٹس لینا بھی گوارا نہ کیا۔ بنی امیہ کے لوگ اقتدار کے نشہ میں بدمست ہو کر شکایت کرنے والوں کے درپے آزار ہو جاتے انھیں طرح طرح سے ستاتے، ان سے اہانت آمیز سلوک کرتے اور برملا کہتے کہ قبائلی خطے تو ہماری تفریح گاہیں ہیں اور وہاں کے لوگ ہمارے نوکر ہیں۔

اس پر مستزاد غلاموں کا وہ گروہ تھا جو محض اسلام کے قانون مساوات کی دلکشی کے باعث حلقہ بگوش اسلام ہوا تھا۔ یہ لوگ جب دیکھتے کہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جا رہا ہے تو انکے جذبات میں بھی اشتعال پیدا ہوتا اور وہ اس میں بھی حق بجانب تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ اسلام ہی تھا جس نے انھیں پہلی مرتبہ غلامی کے قعر مذلت سے نجات دلا کر سرداران قریش کی صف میں لا کھڑا کیا تھا اور انھیں شہرت کے مساوی حقوق سے بہرہ ور کیا تھا

(ایضاً ص ۱۳۲ وفیات الاعیان لابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۵ عیون الاخبار لابن قتیبہ ج ۲ ص ۶۱)

غرضیکہ عثمان اور اُن کے خاندان کے رویہ سے چند سرمایہ داروں اور حکومت کے منصب داروں کو چھوڑ کر باقی تمام لوگ نالاں تھے اور اُن کے گلے شکوہ بجا تھے چنانچہ لوگ عثمان کے اس رویہ کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تاہم ابتدا میں وفود کے ذریعہ اُن کے اس تغافل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور بعض بزرگ صحابہ کو نمایندہ بنا کر عثمان کی خدمت میں بھیجا گیا اور لمبے چوڑے محضر ناموں پر عام مسلمانوں کے دستخط ثبت کر کے اُنکی خدمت میں پیش کیے گئے لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ ایک جلیل القدر صحابی حضرت عمار بن یاسر اس قسم کا ایک محضر نامہ لے کر بارگاہ خلافت میں گئے تو مروان بن الحکم نے عثمان کو یہ مشورہ دیا کہ اس کالے غلام نے لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکایا ہے آپ اسے قتل کر دیں تاکہ شورش پسندوں کے حوصلے پست ہو کر رہ جائیں۔

حضرت عمار بن یاسرؓ قتل ہونے سے تو بچ گئے لیکن انھیں اس موقع پر اس بے دردی سے مارا پیٹا گیا کہ وہ بیہوش ہو گئے اس طرح جب کبھی صوبائی وفود مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت عثمانؓ سے ان کے بھائی بند گورنروں کی شکایت کرتے تو ان کی دادرسی کے بجائے متعلقہ صوبہ کے گورنر کو ان شکایت کرنے کے خلاف انتقامی کاروائی کا حکم دیا جاتا۔ مصر کے وفد کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ حضرت عثمان نے اس وفد کو یقین دلایا کہ ان کی شکایات کی بناء پر گورنر کو معزول کر دیا جائے گا۔ لیکن جب یہ وفد مطمئن ہو کر واپس لوٹا تو راستے میں حضرت عثمانؓ کا قاصد ملا جس کو ایک فرمان کے ذریعہ خلیفہ مذکور نے یہ ہدایت دیکر بھیجا تھا کہ یہ لوگ مصر پہنچیں تو گورنر انھیں قتل کر دے۔ اس پر یہ لوگ بیحد برافروختہ ہوئے اور اصلاح احوال کے بارے میں حضرت عثمان کے رویّہ سے مایوس ہو گئے۔ (ابن اثیر ج ۳)

کچھ لوگ ان تمام باتوں کی ذمہ داری مروان بن الحکم کے سر ڈال کر حضرت عثمانؓ کو اس صورت حال سے بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن دونوں صورتوں میں حضرت عثمان اس الزام سے بچ نہیں سکتے کہ وہ انتہائی نااہل خلیفہ تھے۔ اگر وہ یہ سب کچھ اپنے مشیروں کے ایماء پر کرتے تھے۔ جب بھی ان کی بے دانشی اور بے تدبیری واضح ہوتی ہے اور اگر وہ یہ سب کسی دباؤ کے بغیر از خود اس رویّہ کو اختیار کئے ہوئے تھے تب بھی اسلامی نظام سیاست و حکومت کی رو سے وہ اس قابل نہیں تھے کہ مسند خلافت پر براجمان رہیں۔

یہ کہنا کہ حضرت عثمان مسلمانوں میں خونریزی کو پسند نہیں فرماتے تھے اور ان کے درمیان امن و صلح کی فضا برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیئے انھوں نے اپنے حامیوں کو جوابی کاروائی سے روک دیا تھا۔ انکی زندگی کا عام انداز اس کی بالکل نفی کرتا ہے۔ مصالحت کی بہترین صورت یہ تھی کہ وہ اپنے مشیر خاص اور معتمد خصوصی مروان بن الحکم کو اپنے سے دور کر دیتے اس صورت میں عوام کے جذبات جو ان کے خلاف بھڑک اٹھے تھے۔ بہت حد تک ٹھنڈے پڑ جاتے اور عمومی بغاوت کا خطرہ باقی نہ رہتا مگر انھوں نے اس بس کی گانٹھ کو ایک لمحہ کے لیئے بھی اپنے پاس سے دور نہ کیا۔ نہ اسے اسکے منصب سے ہٹایا۔ ایسی صورت میں امن و صلح کی فضاء کیوں کر قائم رہ سکتی تھی۔ فریقین میں جب کشمکش کا آغاز ہوتا ہے تو اسے ختم کرنے کی واحد صورت یہ ہوتی ہے "کچھ دو اور کچھ لو" کی پالیسی اختیار کی جائے۔ باغیوں کا سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ اپنے اس منہ چڑھے مصاحب کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیں لیکن انھوں نے اس عوامی مطالبہ کی جانب سے کان بند کر لیئے اور یہی بات زیادہ تر فتنہ انگیزی کا باعث بنی۔ حضرت عثمانؓ بن عفان کے قتل کی سب سے زیادہ ذمہ داری اس شخص پر عائد ہوتی ہے اس بدنہاد، دوں فطرت اور روباہ صفت انسان نے حضرت

عثمانؓ کے راستے میں ایسے کانٹے بچھادیئے جنھیں حضرت عثمانؓ کو پلکوں سے چننا پڑا۔

جس دن سے مدینۃ المنورہ میں اس ناپاک وجود نے قدم رکھا اس سرزمین سے خیر و برکت امن و امان رخصت ہو گیا۔ اس کے نجس و نحس سائے نے صرف قصرِ خلافت ہی کو آسیب زدہ نہیں کیا بلکہ مدینہ مقدسہ کی پوری بستی کا سکون اس کی بھینٹ چڑھ گیا۔ حضرت عثمانؓ کی بیوی نائلہ نے ایک موقعہ پر اپنے شوہر کو یہ مشورہ بھی دیا کہ آپ مروان کو اپنے سے دور کر دیں لیکن انھوں نے ایک عورت کی رائے پر چلنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ مروان کو جب نائلہ کے اس مشورے کا علم ہوا تو اس نے کہا "ڈر کر پیچھے ہٹنے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان اپنے غلط موقف پر سختی سے قائم رہے۔"

شروع شروع میں جب باغیوں نے حضرت عثمان کے مکان کو چاروں طرف سے گھیرا اور ان سے استعفیٰ طلب کیا تو حضرت عثمان نے مروان سے کہا کہ وہ جا کر لوگوں کو نرمی سے سمجھائے بجھائے لیکن وہ بالا خانہ کی ایک کھڑکی میں سے منھ باہر نکال انھیں ڈرانے دھمکانے لگا اور کہا تو یہ کہا:

"لعنت ہو تم لوگوں پر کیا یہاں ڈاکہ ڈالنے آئے ہو ہم سے حکومت چھیننا چاہتے ہو۔ اس خام خیالی میں مت رہو کہ ہم تم سے ڈر کر حکومت کی باگ ڈور تمہارے سپرد کر دیں گے اور خود خانہ نشین ہو جائیں گے۔"

مروان کی یہی روش بالآخر حضرت عثمانؓ کے قتل کا باعث بنی اور اس اعتبار سے وہ بدترین مجرم تھا افسوس کہ قتلِ عثمانؓ کے واقعہ کو مسلمانوں نے اس کے حقیقی رنگ میں کبھی نہیں دیکھا اور نہ یہ بات مسلمان قوم کی شاندار اور تابندہ روایات میں شمار ہونے کے قابل تھی کہ مملکت کا سب سے بڑا حاکم بھی اگر شریعت کے احکام کو پس پشت ڈال دے تو اس کا حشر وہ

ہوا کرتا ہے، جو عثمانؓ بن عفان کا ہوا۔

ایک حدیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خطبہ کا ذکر ہے جس میں حضورؐ نے انتہائی تاکید کے انداز میں امت مسلمہ کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ۔

"ولتاخذن علی ید الظالم ولتاطرنہ اطراً"

تم ضرور ظالم کا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دو۔

خود حضور سرورِ کائنات جن کی زبان مبارت وحی سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون الٰہی کا درجہ رکھتا ہے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، آپ کا دستور تھا کہ جب آپ صحابہ سے اپنی اطاعت کی بیعت لیتے تو وضاحت فرما دیتے کہ میری اطاعت صرف بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ہوگی۔

قیصر روم کے دربار میں حضرت معاذ بن جبل نے 'امیر المومنینؓ' کی ذوردن کا رکا تعارف کراتے ہوئے رومیوں کو بتایا تھا کہ:

"امیر نا رجل منّا ان عمل فینا بکتاب دیننا و سنۃ نبیّنا قررناہ علینا و ان عمل بغیر ذالک عز لناہ عنّا۔"

ہمارا امیر ہم میں سے ایک آدمی ہوتا ہے۔ اگر وہ قرانِ مقدس اور سنتِ نبوی کے مطابق عمل کریگا تو ہم اسے برقرار رکھیں گے۔ اور اگر اس کا رویہ شریعت کے خلاف ہوگا تو ہم اسے معزول کردینگے۔

ان تابندہ روایات کی خاطر قوم عثمانؓ بن عفان جیسے خود سر خلیفہ کو آخر کہاں تک برداشت کرتی۔ حضرت عثمان کے لیئے موزوں راستہ یہی تھا کہ وہ خود بخود حکومت سے کنارہ کش ہو جاتے مگر چونکہ انھوں اقتدار پر قابض رہنے کو ترجیح دی اس لیئے امت کے پاس

اسکے سوا کیا چارہ کار تھا کہ وہ ہر قیمت پر ان سے پیچھا چھڑاتی:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خذ والا عطا مادام اعطاء اما اذا صاور شوة على الدين فلا تاخلوه ولستم تبار كيه يمنحكم الفقرو الحجة الان رباني مرح قدادارت وقتل قتل بنو مرح الان وحا الاملامرد اثرة قد ورمع الكتاب الدين الكتاب والسلطان سيفتر قان فلاتضار قوالكتاب.

دوانه سيكون لكم امراء ان اصعتمو هم اضلو كم وان عصيتوهم حذ لوكم قالو افكيف نضع يا رسول الله؟ قال كما صنع اصحاب عيسى بن مريم نشروا بالمنا شير وحملوا على الخشب موت في طاعة الله خير من حياه في معصية الله. (بیہقی)

عطیات اسی وقت تک قبول کرو جب تک ان کی حیثیت عطیہ کی رہے اور جب دین کے معاملہ میں رشوت بن جائیں تو ایسے عطیات کو قبول کرنے سے انکار کر دو لیکن تم اس رشوت ستانی سے بچ نہیں سکو گے۔ تمہاری ضرورتیں تمھیں ان کے قبول کرنے پر مجبور کریں گی یاد رکھو کبر و نخوت والے لوگوں کا دور ختم ہو گیا۔ اب اسلام کا دور اقتدار شروع ہوا ہے اس لیئے کتاب الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرو۔ یاد رکھو کہ ایک دور آنے والا ہے جب حکمران قولہ خدا کی کتاب کے خلاف عمل پیرا ہوگا ایسے پر آشوب دور میں تم کتاب الٰہی کی اطاعت کرتے رہنا۔ کتاب خداوندی کی اطاعت سے ہرگز انحراف کی راہ اختیار نہ کرنا۔ تم پر ایسے لوگ مسلط ہو جائیں گے کہ اگر تم انکی اطاعت کرو گے تو وہ تمھیں غلط راستے پر ڈال دینگے اور اگر تم انکی نافرمانی کرو گے تو تمھیں ذلیل و رسوا کریں گے صحابہ نے عرض کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے وقت میں ہمارے لیئے کیا حکم ہوتا ہے؟ فرمایا تم عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب کی مانند اپنے دین پر قائم رہنا کہ انھیں آروں سے چیر دیا گیا اور سولیوں پر لٹکا دیا گیا مگر ان کے پائے عزیمت و ثبات قدم میں لغزش نہیں آئی اللہ کے راستے میں مر جانا اسکی نافرمانی کرتے ہوئے زندہ رہنے سے ہزار گنا بہتر ہے۔

اسلامی تاریخ سیاست کا میکیاولی

(چندرھوی صدی کے آغاز میں میکیاولی)

میکیاولی نے سیاست کے جو آداب مرتب کئے اور سیاست کے حدود میں اخلاقی قدروں کی جس انداز میں نفی اور قوت وفریب (force & fraud) کے ابلیسی نظریہ کا جس طرح پرچار کیا، امر واقعہ یہ ہے کہ وہ بیچارہ تو مفت میں بدنام ہوا۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس باب میں اولیت کا شرف امیر معاویہ کو حاصل ہوا۔ انھوں نے اس سے بہت پہلے ساتویں صدی عیسوی یا پہلی صدی ہجری میں اس نظریہ کو عملاً اختیار کیا۔

معاویہ میکیاولی فلسفۂ سیاست کہ اس اصول پر عمر بھر کار بند رہے کہ مقاصد کے حصول کی راہ میں غلط ذرائع اور نا جائز وسائل کا استعمال کچھ برا نہیں ہے۔ بشرطیکہ مقاصد حاصل ہو جائیں۔

معاویہ نے اقتدار پر قبضہ جمانے کے لیئے ان تمام قیود کو توڑا جو ان پر مذہب کی طرف سے عائد ہوتی تھیں اور ان حدود سے ہمیشہ تجاوز کیا جو اسلام نے متعین کی تھیں۔

معاویہ کے اخلاقی اور سیاسی جرائم میں سے سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے پاکباز انسان کے سیاسی حریف بنے۔ معاویہ نے سیاست میں جس فریب، دھاندلی،

عیاری اور مکروزور سے کام لیا۔ علیؑ ابن ابی طالب جیسا راست باز انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیئے معاویہ کامیاب رہا اور حضرت علیؑ بظاہر ناکام ہو گئے معاویہ کے مقابلہ میں علیؑ ابن ابی طالب کی شکست ہی علیؑ کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ مشہور فلسفی وال پول نے ٹھیک کہا تھا کہ "نیک انسان کسی بڑی سلطنت کو زیرِ نگین رکھنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہمیشہ اخلاقی حدود کے اندر رہ کر کام کرتا ہے۔ دنیاوی سیاست میں ایسے شخص کی کامیابی معلوم ہے۔

تمام کتب تواریخ وسیر اس پر متفق ہیں کہ امیر معاویہ نے حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے مقابلہ میں ہر وہ حربہ استعمال کیا جو شرافت واخلاق کی رو سے قطعاً ناروا تھا اور جس کی توقع ایک مسلمان اور صحابیِ رسول کجا، ایک شریف آدمی سے بھی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

معاویہ نے زمام حکومت پر قبضہ کرنے کے لیئے ہر وہ حربہ استعمال کیا جو اسلامی ضابطۂ اخلاق کی رو سے قطعاً ناروا اور نامناسب تھا اور اُنکے مقابلہ میں حضرت علیؑ کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ کہیں کسی موقع پر بھی حدود اللہ سے متجاوز نہیں ہوئے اور انھوں نے ضابطۂ اخلاق وآداب کو کسی مرحلہ پر بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا جیسا کے ایک موقع پر انھوں نے خود فرمایا:

لولا الدینُ لکُنت ادھی العربُ   اگر مجھے دین کے پاس نہ ہوتا تو میں عرب کا سب سے بڑا سیاست داں ہوتا۔

دراصل حضرت علیؑ اور معاویہ کی باہمی کشمکش تقویٰ ودیانت اور ہوسِ اقتدار کی جنگ تھی۔ اسمیں کامیابی اسی کا مقدر تھی جو:

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی

کے مصداق جائز وناجائز کی پرواہ کیئے بغیر تمام حدود اللہ کو ٹھکراتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

معرکۂ صفین میں معاویہ کی فوجوں نے علیؑ ابن ابی طالب کے لشکر پر پانی بند کر دیا۔ حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے معاویہ کے پاس قاصد بھیجا کہ پانی چونکہ ضروریاتِ زندگی میں سے ہے اس لیئے انسانیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیں اور ہماری فوج کو پانی سے محروم نہ کیا جائے۔ معاویہ شرافت واخلاق کی زباں کہاں سمجھتے تھے۔ انھوں نے بڑی حقارت سے مطالبہ کو ٹھکرا دیا۔ مجبوراً حضرت علیؑ کو فوجی کاروائی کے ذریعہ معاویہ کے لشکر کو پیچھے دھکیلنا پڑا۔ اور پانی پر حضرت علیؑ کی فوج قابض ہو گئی اس پر نوجوانوں کی ایک جماعت نے انتقامی کاروائی کے طور پر معاویہ کے لشکر کو پانی سے محروم کرنا چاہا جب حضرت علیؑ نے اس ارادے کی اطلاع سنی تو آپ نے ان نوجوانوں کو بلا کر ڈانٹا اور فرمایا:

"خلو امن الماءِ حاجتکم وارجعوا الی عسکرکم و خلّو عنھم فانّ اللہ عزّوجل قد نصرکم علیھم بظلمھم و بغیھم"

اپنی ضرورت کے مطابق پانی لیکر واپس لشکر میں پہنچ جاؤ اور ان شقیوں کے پانی لینے یا پینے میں رکاوٹ پیدا نہ کرو کیونکہ ربّ العزت نے تمھیں ان کے مقابلہ میں کامیاب فرمایا ہے اور ان کے ظلم اور سرکشی کے مقابلہ میں تمہاری امداد فرمائی ہے۔

یہ تھا وہ اسلامی جذبۂ اخلاق جو حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی طبیعت کا خاص جوہر تھا اور جس نے انھیں اپنے بے اصول اور انسانیت کے معیار سے کہیں فروتر حریفوں کے مقابلہ میں ناکام کر دیا۔

وسیع النظر مورخ عطا حسینی بک نے جو پیرس کی انجمن علمی وجغرافیائی کے رکن رکین تھے۔ اپنی معرکتہ الآرا کتاب "خواطر انی الاسلام" میں حضرت علیؑ اور معاویہ کی سیاست کا

تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"انّ الامام علیاً لم یکن متوکلا علی الحیاۃ بل علیٰ الخلق وا
یکن یستنصر الخداع بل کان نصیرہ الصدق وما کان ینقصہ ذالک
عن تقصیر و عجز بل تدینا و تجھد الا نہ یابی الا الحق الصرح و
الخدمۃ النصوحۃ اذن کان الناس یحترطون من حولہ شدتہ و ینفقون
حول معاویہ لسماحہ وکرمہ وسخائہ و رغد العیش فی قریدہ و
شتان بیذمن یعمل لدیناہ وبین من یعمل الا خراہ"

"امام علی ابن ابیطالبؑ مکر و فریب کا سہارا لینے کے بجائے ہمیشہ حق و صداقت پر اعتماد کرتے تھے اُنھوں نے سیاست میں کامیابی کے لئے کبھی دھوکہ بازی سے کام نہیں لیا بلکہ ہمیشہ سچائی کی مدد کے طلبگار رہے اُن کا یہ طرزِ عمل اُن کی خامی نہیں ہے کہ اُنھوں نے بے بسی اور درماندگی کی بنا پر اسے اختیار کیا ہو بلکہ اس کا اصل باعث اُن کی دین داری اور تقویٰ شعاری تھی وہ طبعاً اور فطرتاً نفسانیت سے پاک اور بے لوث انسان تھے ہمیشہ حق کے جویا اور صداقت کے خواہاں رہے اور خدمت محضہ اور خالصہ ان کا مطمح نظر تھی۔ ان کی دینداری کے باعث اور دین میں شدت پسندی کی وجہ سے لوگ اُن سے ہٹ کر معاویہ کے دامن میں پناہ لیتے تھے کیونکہ معاویہ کے یہاں دین کے معاملہ میں تساہُل بھی تھا اور وہ فیاضی اور سخاوت بھی کرتے تھے اور اُن کے یہاں عیش و عشرت کا سامان لوگوں کے لئے بافراغت مہیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایک ایسا شخص جو محض دنیا طلبی کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہو اُس کے مقابلہ میں وہ شخص کیوں کر کامیاب ہو سکتا ہے جس کا ہر عمل خدا کی رضا جوئی اور آخرت کی سر خروئی کے لئے ہو" تاریخ کی معتبر و مستند اور قابل وثوق و اعتماد کتابوں میں یہ بات مذکور

...وج ہے کہ:۔

معاویہ شام اور اُس کے ملحقہ علاقوں میں بڑی حکمت عملی ہوش مندی کے ساتھ حکومت پر قبضہ کرنے کی کوششوں میں سرگرم کار تھے۔

مسعودی نے "مروج الذہب" میں لکھا ہے کہ:۔

معاویہ نے فیاضی اور داد و دہش سے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کی ہر ممکن تدبیر کی اور ہر موافق و مخالف کے لئے بیت المال کا منہ کھول دیا، دوست تو بجائے خود رہے وہ اپنے دشمنوں اور اپنے حریفوں کو بھی اسی حربے سے قابو میں کر لیتے تھے اس سلسلہ میں عقیل ابن ابیطالب، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زمعہ، عمرو العاص، حسان بن مالک اور ایسے دوسرے بہت سے لوگ گنائے جا سکتے ہیں جو ابتداء میں اُن کے مخالف تھے مگر اُنھوں نے پیسے کے زور سے اُنھیں رام کر لیا اور یہ لوگ اُنہی کے پاس جا کر آباد ہو گئے۔

عقیل نے اپنے بھائی سیدنا علی ابن ابیطالبؑ سے بیت المال میں اپنے جائز حق سے زیادہ کا مطالبہ کیا مگر حضرت علیؑ نے اُن کا مطالبہ یہ کہکر مسترد کر دیا کہ "میں تمہارے حصّہ سے زیادہ ایک درہم بھی نہیں دونگا"۔ اس پر عقیل بگڑ گئے اور حق و صداقت کے پرستار بھائی سے ناراض ہو کر معاویہ کے پاس شام چلے گئے اور مستقل طور پر معاویہ کے پاس رہنے لگے وہ کہا کرتے تھے:۔

"میرا بھائی میرے دین کا بھلا چاہتا تھا مگر معاویہ نے میری دنیا سنوار دی" (ابن ابی الحدید۔ اصابہ فی معرفۃ الصحابہ لاستیعاب لابن عبدالبر) حسان بن مالک جو شام میں قبائل قحطان کا سردار تھا اس کو معاویہ نے اس شرط پر اپنا حامی بنالیا کہ اس کے زیرِ اثر قبیلوں کے دو ہزار اشخاص کو فی کس دو ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ دینگے اور یہ رقم وراثتاً قائم رہے گی مزید برآں

اُس کو یہ لالچ بھی دیا گیا کہ سرکاری دربار میں وہ خصوصی اعزاز و مراعات کا حق دار ہوگا۔

غیر ملکی سامراج اور جبر و استبداد کے بل پر قائم ہونے والی قومی حکومتوں کے بارے میں یہ بات سننے میں آئی کہ وہ ضمیر فروشی کا ایسا تھوک کاروبار کرتی ہوں جیسا کہ معاویہ نے اپنے عہد حکومت میں کیا پاکستان کے سرحدی قبائل کے متعلق تو یہ سنا تھا کہ انگریزی استعمار نے اُن کی شورش سے تنگ آ کر اپنے بجٹ کی ایک خطیر رقم اُن کے لئے مخصوص کر دی تھی تا کہ ملک میں امن وامان کی فضا برقرار رہ سکے لیکن معاویہ خود اپنی ہی قوم کو بڑی بڑی رقمیں دیکر کس لئے خرید رہے تھے؟

سیاسی رشوت دینے کی رسم کا آغاز اگر چہ عثمان نے کیا لیکن معاویہ نے تو اسے درجہ کمال تک پہنچا دیا لوگوں کو اپنا ہم خیال اور حامی بنانے کا اس حد تک جنون تھا کہ غلط صحیح کا امتیاز بھی انھوں نے اُٹھا دیا تھا۔

کوفہ کا ایک شخص اپنی اونٹنی پر سوار دمشق سے آ رہا تھا راستہ میں اُسے ایک شامی، نے گھیر لیا اور کہا یہ اونٹ تو میرا ہے اور یہ وہی اونٹ ہے جو تم نے مجھسے جنگ صفین کے موقع پر مستعار لیا تھا جب جھگڑا بڑھا تو شامی اونٹ کے مالک کو لیکر امیر معاویہ کے پاس پہنچا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں پچاس گواہ پیش کئے امیر معاویہ نے فیصلہ شامی کے حق میں دے دیا اور کوفی سے اونٹ چھین لیا گیا۔ اونٹ کے مالک نے جب یہ ماجرا دیکھا تو کہنے لگا "خدا تمہاری اصلاح کرے یہ اونٹ نہیں اونٹنی ہے" امیر معاویہ کہنے لگے "اب جو فیصلہ ہو چکا ہے اُسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا"

جب مجلس برخواست ہوئی تو معاویہ نے اُس شخص کو تنہائی میں اپنے پاس بلا کر دگنی قیمت ادا کی اور اُس سے کہا کہ "علی ابن ابیطالب سے جا کر کہنا کہ معاویہ آپ کے مقابلہ میں

ایک لاکھ فوج لیکر آ رہا ہے، جن میں اکثر لوگ ایسے ہیں جو اونٹ اور اونٹنی کا فرق تک نہیں جانتے"۔

تبرّا کی رسم بد

امیر معاویہ نے امام برحق حضرت علی ابن ابیطالبؑ کو برسر عام سب وشتم کا نشانہ بنانے کی رسم بد کا آغاز کیا اُن کے نامۂ عمل کی سیاہی کے لئے یہی ایک چیز کافی ہے کیا اسلامی تعزیرات کی رو سے یہ جرم قابل معافی ہے؟ ہر بات میں اجتہادی غلطی کا عذر پیش کرنے والے اس گستاخی کو نہ جانے کس طرح سند جواز بخشیں گے اور اجتہادی یہ کون سی انوکھی اور نرالی قسم ہے (طبری جلد ۴ ص ۱۸۸ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۳۴ ص ۱۵۴ البدایہ ج ۷ ص ۲۵۹ ج ۸ ص ۸۰)

اگر اجتہاد اسے کہتے ہیں کہ اپنے عہد کے شریف ترین انسان ابن عم پیغمبرؐ دختر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شوہر اور بقول اقبالؔ:۔

تاجدار حل اتیٰ مرتضیٰ مشکل کشا

شیر خدا اور مسلم اول شہ مرداں علی

پر لعن وملامت کی باقاعدہ مجالس منعقد کی جائیں اور تبرائیوں کو انعام واکرام سے نوازا جائے تو خدارا ہمیں بتایئے کہ یہ اجتہاد ہے یا الحاد؟ اور کیا یہ اجتہادی غلطی ہے یا کفر و ارتداد؟

حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ پر یہ سبّ وشتم صرف دمشق تک محدود نہ تھا بلکہ امیر معاویہ خود بھی اور ان کے تمام گورنر خطبہ جمعہ میں بڑے التزام کے ساتھ دشنام طرازی کی یہ رسم ادا کرتے تھے حتیٰ کہ مسجد نبوی میں عین روضۂ اطہر کے سامنے حضورؐ ہی کے منبر سے حضورؐ کے

محبوب ترین صحابی کو مغلظات کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

جس پیغمبرؐ نے سباب المومن فسوق (مومن کو گالی دینا گناہ عظیم ہے) کی تعلیم دی ہو اور جس نے اذکروا موتاکم بالخیر ۔(اپنے مرے ہوؤں کو بھلائی سے یاد کرو) کا سبق دیا ہو، خود اسی کے آستانہ جلال میں کھڑا ہو کر اس کی امت کا ایک فرد اس کے قرابت داروں اور عزیز ترین ساتھیوں کو گالیوں سے نوازتا ہے اور ہماری بے غیرتی اور بے حسی کا یہ عالم کہ ہم ایسا کرنے والے کی تعریف میں قصیدے لکھتے اور کتابیں چھپاتے ہیں اور آسمان پھٹ نہیں پڑتا اور زمیں کا کلیجہ شق نہیں ہو جاتا۔

اگر حقیقت اسلام در جہاں این است

ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی

سب وشتم کی اس ملعون رسم کے خلاف جس کسی نے بھی آواز اٹھائی اور موافقت سے گریز کیا اس کو عبرت ناک سزا دی گئی۔ مشہور صحابی حضرت حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو محض اس قصور پر قتل کر دیا گیا کہ وہ علیؑ پر لعنت کیوں نہیں بھیجتے۔ قتل گاہ میں بھی ان سے یہی مطالبہ کیا گیا کہ اگر وہ اس مرحلہ پر حضرت علیؑ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہہ دیں تو ان کی جان بچ سکتی ہے اس پر حضرت حجر بن عدی نے فرمایا:

"میں ایسی کوئی بات زبان سے نہیں نکالوں گا جو خدا کی ناراضگی کا باعث بنے" حضرت حجر کے ایک ساتھی عبدالرحمان بن حسان کو امیر معاویہ نے واپس کوفہ بھجوا دیا اور زیاد کو لکھا کہ "انھیں بدترین طریقہ سے قتل کرو"

اس پر اس حرامی بچہ نے انھیں درگور کر دیا۔

(طبری ج ۴ ص ۱۹۰ تا ص ۲۰۷۔ الاستیعاب لابن عبدالبر ج ص ۱۳۵۔ ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۳۴

۲۳۴، البدایہ والنہایہ ص ۵۰)

خلیفۂ برحق کے خلاف خروج و بغاوت معاویہ کی اس گھناؤنے کردار کا ایک رخ ہے اس پر ان کا بڑے سے بڑا معتقد بھی پردہ نہیں ڈال سکتا۔ وہ ایک صوبے کے گورنر ہوتے ہوئے علی ابن ابی طالب جیسے خلیفۂ راشد سے برسر پیکار ہوئے اور امام عصر کے مقابلہ میں سرکشی اور طغیانی کی راہ اختیار کی اور یہ وہ جرم ہے کہ خواہ کسی صحابی سے سرزد ہو یا کسی ولی اللہ سے اسے اجتہادی غلطی قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فسادی الارض ہے معاویہ بن ابی سفیان دیدہ و دانستہ اس جرم کے مرتکب ہوئے اس لیئے وہ قرآن مقدس کی اس آیت کی وعید کے ہر طرح مستحق ہیں۔

انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ و یسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم و ارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض ذلک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الآخرة عذاب عظیم۔

"جو لوگ اللہ اور اسکے رسول سے برسر پیکار ہوتے ہیں اور زمین پر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا دار پر کھینچا دیا جائے یا انکے ہاتھ اور پاؤں ایک دایاں اور دوسرا بایاں کاٹ دیا جائے یا انھیں ملک بدر کر دیا جائے۔ یہ تو دنیا کی رسوائی کا عذاب ہے اور آخرت کی سزا بڑی ہی سخت ہوگی۔"

خلیفۂ عادل کے خلاف آمادہ پیکار ہونا اللہ اور اسکے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہے اور امیر معاویہ کا یہ زندگی بھر کا سرمایہ امتیاز ہے۔ وہ دنیا کی ذلت سے تو وقتی طور پر بچ گئے مگر دنیا میں بھی انکو ذلت و خواری قیامت تک ملتی رہے گی اور آخرت کی گرفت میں تو وہ

جکڑے ہی جا چکے ہیں۔

و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

دراز دستی ایں کو استیناں میں

معاویہ ابن ابی سفیان اور انکے وارث تخت یزید پلید کے بارے میں نام نہاد اعیان علم ومشیخت کا ایک طبقہ اس ناپاک کوشش میں مصروف ہے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کو اسلام کے نامور ہیرو بنا کر امت کے سامنے پیش کیا جائے اور انکی قرار واقعی حیثیت کے بارے میں عوام میں غلط تصورات پھیلائے جائیں۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی "یوم معاویہ" کا انعقاد ہے جو اب بڑی باقاعدگی کے ساتھ سال بہ سال منایا جا رہا ہے اور یوں ایک ایسے فتنے کو ہوا دی جا رہی ہے جس کی شعلہ سامانی اس امت کی رہی سہی ساکھ کو بھی بھسم کر کے رکھ دے گی۔

ملتان میں ایک نامور مذہبی اور سیاسی خطیب کے فرزند ناخلف نے اس تقریب نامرضیہ کی ابتدا کی اور اس فتنہ کو اپنے دامن سے ہوا دی ہے پہلے پہل ملتان ہی میں "یوم معاویہ" منایا گیا۔ اس سلسلہ میں جو اشتہار شائع کیا گیا وہ خبث باطن کا شاہکار ہے اس میں معاویہ جیسے تریخ اسلامی کے سب سے بڑے مجرم کے لیئے جو خطابات بے دریغ استعمال کئے گئے وہ حسب ذیل تھے۔

"امیر المومنین، امام المتقین، خلیفۂ عادل، قائد ایاستہ والمدبرین، فاتح روم و یورپ و افریقہ، حاکم و پیشوائے امام امیر الشام کا معتمد و محبوب ابوبکر و عمر، ہادی اہل سنت محسن و مہدی امت منبع جود و سخا، پیکر علم و وفا، خال المسلمین، برادر نسبتی رسولؐ، صحابی مقبول، کاتب

الوحی، سیدنا مولانا ابو عبدالرحمان معاویہ بن ابی سفیان

(اشتہار یوم معاویہ ۶، الرجب ۱۳۸۳ھ)

یہ الفاظ اپنے ظاہری طمطراق کے باوجود بے حقیقت اور بے وزن ہیں اور ان کی حیثیت محض ڈھول کے پول کی سی ہے۔

اے طبل بلند بانگ در باطن ہیچ

اس قسم کی لفاظی سے اگر انسان کے مرتبہ و مقام کی عظمت ثابت کی جا سکتی تو فن تاریخ و روایت عقل و دانش اور شعور و درایت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے اسے جو چاہا بنا دیا۔ وقعات و حقائق کی پردہ پوشی لفظوں کے تانے بانے بننے سے نہیں ہوا کرتی۔ رات کو دن کہنے والی مخلوق سے اللہ نے انسان کو ممیز و ممتاز کیا ہے اور کانچ کے ٹکڑے کو لعل شب چراغ کہنے والوں کا ٹھکانہ انسانی آبادیوں سے دور بنایا جاتا ہے۔ تعصب اور ہٹ دھرمی کی بات دوسری ہے ورنہ غلاظت کے ڈھیر کو اگر کوئی دیوانہ مشک و عنبر کا انبار کہہ کر اسکا اسٹور اپنے بیچنے لگے تو اس کی قیمت میں اضافہ نہیں ہوگا اور مشام جاں کو معطر کرنے کی صلاحیت اس میں پیدا نہیں ہو سکے گی۔ دنیا الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسنے کے بجائے عمل کی روداد دیکھ کر فیصلہ کیا کرتی ہے کہ کون کس قابل ہے ورنہ جہاں تک خطابات و القاب کا تعلق ہے ان کا بیجا استعمال ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے اس برصغیر میں انگریز حکمراں تھا۔ اس نے ہر ضمیر فروش ملا کو شمس العلما کا خطاب دے رکھا تھا اور جو شخص بھی اپنی متاع ایمان کو جنس فرومایا بنا کر بیچتا تھا اور اپنے سرمایہ غیرت قومی کی نیلامی بولنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ اُسے سر خان بہادر خاں صاحب اور اسی قسم کے بھاری بھرکم خطابات سے نوازا جاتا تھا۔ ہندوستان کے ایک ظریف شاعر احمق پھپھوندوی نے ٹھیک کہا تھا۔

اہل عالم کی ننگ میں جو گدھا ہوتا ہے
دور انگریز میں شمس العلما ہوتا ہے

بالخصوص مسلمان تو اپنی خطاب شخصیوں کے معاملہ میں دنیا کی ہر قوم سے سبقت لے جا چکے ہیں اور القاب کا طومار باندھنے میں تو کوئی قوم انکی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

جہاں تک معاویہ بن ابی سفیان کے امیر المومنین ہونے کا تعلق ہے تو یہ مسلمانوں کی پرانی ریت ہے کہ وہ ہر اس شخص کو جو انکے ملک میں کبھی مسند اقتدار پر براجمان رہا ہو بیدریغ امیر المومنین کہتے چلے آئیں ہیں۔ اسلامی تاریخ میں ایسے بہت سے ظالم و جابر اور فاسق و فاجر حکمران گزرے ہیں جنھیں بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ منبر رسولؐ پر کھڑے ہو کر امیر المومنین کہا جاتا رہا ہے، اور تو اور لکھنؤ کے واجد علی شاہ اور مصر کے شاہ فاروق تک اس خطاب سے نوازے جا چکے ہیں پھر اگر ان کے لیئے یہ لقب شرف و مجد کا باعث نہیں بن سکا تو معاویہ بن ابی سفیان کے لیئے اس اعزاز و امتیاز کی کیا بات ہے؟

پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور اقتدار میں اس کے زیر اقتدار علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد دوسری قوموں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی لیکن مسلمان (چشم بدور) اس کی غلامی کا طوق بھی اپنے گلے میں ڈال چکے ہیں اور اسے اپنا بادشاہ مان کر اسکی وفاداری کا حلف اٹھاتے رہے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ بھی حق رکھتا ہے کہ اسے 'امیر المومنین' کہا جائے اور ایسے دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ اسے امیر المومنین کہا گیا۔

انگریزوں کے دور اقتدار میں مسلمانوں کی کافی بڑی تعداد اور انگریز کے تنخواہ دار ملا ایڑی چوٹی کا زور اس بات پر صرف کرتے رہے کہ انگریزوں کو "اولی الامر" ثابت کیا جا سکے اس ضمن میں بعض خود فروش علماء اور زعماء نے ایسی کتابیں لکھیں جن میں آیات قرآنیہ سے

انگریز کی وفاداری اور اسکی غیر مشروط اطاعت کی اہمیت واضح کی گئی تھی۔ اس مفسرانہ موشگافی سے ملکہ وکٹوریہ اور اسکے جانشین بھی اس اعزاز کے حقدار ثابت ہوتے ہیں ہندوستان میں علماء و مشائخ کی ایک معتدبہ جماعت نے انگریز کے باغیوں کو غدار مفسد و باغی اور گروہ اشرار کے خطابات سے نوازا اور انگریز کی مخالفت کو مذہبی اور دینی اعتبار سے خروج و بغاوت سے تعبیر کیا۔ کسی گمنام مصنف کا لکھا ہوا ایک رسالہ جو انڈیا آفس لائبریری سے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے مستعار کیا تھا راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے اس رسالہ میں قرآن و سنت سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ حکومت وقت یعنی انگریز کی اطاعت مذہبی فریضہ ہے اسکی مخالفت کفر و فساد کے مترادف ہے۔ انگریزی اقتدار کے مخالفین کو اس رسالہ میں "ایں گروہ اشرار کہ فساد را استوار ساختند" کے الفاظ بد سے یاد کیا گیا ہے۔

جو قوم انگریز کو اولی الامر تسلیم کر سکتی ہے اور جس قوم کو عددی اکثریت کے باوجود مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی ہوس اقتدار کا تختۂ مشق ستم بنا سکتا ہے وہ اگر معاویہ بن ابی سفیان اور یزید پلید کو امیر المومنین تسلیم کرے تو اس میں تعجب کیا ہے۔ یہ تو مسلمان قوم کی روایات کا ناگزیر حصہ بن چکا ہے کہ وہ خود امیر معاویہ کے الفاظ میں "اکلۃ الاکل" دھر کھانے والے کے لیئے لقمہ زم بنتی چلی آئی ہے اور ہر بر خود غلط حکمراں کی تائید و حمایت میں مذہبی رہنماؤں اور سیاسی پیشواؤں نے قران و حدیث سے استفادہ کیا ہے اور اس کی حکومت کو عین مقتضائے شریعت کر دکھایا ہے:

ملے جو حشر میں لے لوں زبان واعظ کی
عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لیئے

امیر معاویہ کو امام المتقین کہنا البتہ بہت بڑی جسارت ہے اور یہ ایک ایسی بیہودگی

ہے جس کے لیئے کوئی تاریخی عقلی اور مذہبی جواز موجود نہیں ہے۔ متقی وہ ہے جس کا دل خوف خدا سے معمور ہو اور جس کی زندگی کا ہر عمل تقوی کی حدود کا پابند ہو اگر معاویہ صرف متقی ہی نہیں بلکہ امام المتقین تھے تو جس شخص سے وہ اور برسر پیکار تھے۔ وہ تو یقیناً تقوٰی کی صفت سے عاری ہوگا جبھی تو امام المتقین زندگی بھر اس کی مخالفت کرتے رہے اور مرنے کے بعد بھی اسکو برا بھلا کہتے رہے، خود ڈرانے والے دو شخص تو کبھی ایک دوسرے کے حریف نہیں بن سکتے تو علیؑ ابن ابی طالب اور معاویہ ان دونوں میں سے کون تقوٰی کی راہ پر گامزن تھا اور کون خوف خدا سے بیگانہ وار اپنے اغراض مشومہ کے حصو کے لیئے سرگرم جنگ و تاز تھا اس کا فیصلہ تاریخ کا ایک ادنے سا طالب علم بھی کر سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ فیصلہ تاریخ کی روشنی میں اور کتاب و سنت کے مطابق صادر کیا جائے معاویہ ابن ابی سفیان کو خلیفۂ عادل کہنا اسی صورت میں درست اور قابل تسلیم ہوگا۔ جب پہلے یہ بات ثابت ہو جائے کہ انکی خلافت عام مسلمہ اسلامی روایات کے عین مطابق وجود میں آئی تھیں۔ اگر انکی خلافت کے لیئے کوئی سند جواز مہیا نہ کیا جا سکے تو عدل تو بڑی دور کی چیز ہے ابن کثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں خود امیر معاویہ کا ایک خطبہ روایت کیا ہے جس میں امیر معاویہ نے حکومت پر بزور شمشیر قبضہ کرنے کا صاف و صریح اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے مدینہ منورہ میں یہ خطبہ دیا، انھوں نے کہا۔

اما بعد فانی واللہ ما ولیت امرکم حین ولیتہ انا اعلم انکم لا تسرون ولایتی ولا تحبہا وانی نعلم بما فی نفوسکم من ذالک ولکنی خالستکم بسیفی ھذا مخالسۃ.

(البدایہ والنہایہ، ابن کثیر ج ۸ ص ۱۳۲)

جب سے زمام حکومت میرے قبضہ و تصرف میں آئی میں اس حقیقت سے بخوبی

واقف ہوں کہ تمھیں یہ بات سخت ناگوار گزری ہے اور تم میرے اقتدار سے خوش نہیں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے مجھے اسکی خبر ہے مگر اس بات کو مت بھولو کہ میں نے اس تلوار سے تمہیں زیر کیا یہ اس لیئے تمھیں میرا اقتدار تسلیم کرنا ہوگا۔ کیا عدل اسی کا نام ہے کہ عوام کی مرضی کے بغیر ان پر مسلط ہو کر داد حکمرانی دی جائے اگر یہ عدل ہے تو ظلم کس جانور کا نام ہے یا امیر معاویہ کا محض اس لیئے عدل مان لیا جائے کہ ہماری بدقسمتی سے ان کا نام صحابہ کی فہرست میں شامل ہے اور وہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے پیدا ہوئے تھے؟ قرآن مقدس نے تو اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی عدل کی تلقین کی تھی کہ۔

ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلو ھوا قرب للتقوی

کسی قوم کی دشمنی تمھیں طریق عدل سے منحرف نہ کرنے پائے ہر حال میں ہر ایک سے عدل کرو۔ یہی تقوٰی کا قریب ترین راستہ ہے۔

عام مسلمانوں کو چھوڑیئے کیا علی ابن ابی طالبؑ سے ان کا معاملہ عدل کی بنیادوں پر استوار تھا؟

خطابات والقاب کی فہرست میں قائد السیاسہ والمدبرین کے بھاری بھرکم الفاظ بھی موجود ہیں ہمیں تسلیم ہے کہ معاویہ بڑے سیاست داں مدبّر تھے اور ان کے بعد جتنے بھی حکمراں گزرے وہ انھیں کے نقش قدم پر چلتے رہے، لیکن ان کی سیاست و تدبیر کا مزاج قطعاً غیر اسلامی تھا انکی سیاست بے خدا سیاست تھی۔ وہی جوڑ توڑ وہی سازشیں، وہی ہتھکنڈے، وہی چال بازیاں اور دسیسہ کاریاں جو موجودہ دور کے سیاست دانوں کا طغرائے امتیاز ہیں، امیر معاویہ میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں اور کوئی مورخ انکی ان خصوصیات سے انکار نہیں کر سکتا مگر کیا اسلام کے دستور اخلاق و سیاست میں ان خصوصیات کو بہ نظر استحسان

دیکھا گیا ہے اور کیا ایک دغاباز، بدعہد، مکار، فریبی اور ہوس واقتدار کا شکار شخص اسلام کے معیار سیاست کی رو سے نیک اور پاکباز متصور ہوسکتا ہے بلکہ کیا ایسے شخص پر لفظ "مسلم" کا اطلاق بھی درست ہے؟ حاکم و پیشوائے انام تو ایک بد طینت کا فرد لطف بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں امیر معاویہ کا کیا کہا جائے۔ ہر وہ شخص جس کے ہاتھ میں اقتدار کا ڈنڈا ہوا سے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ جس راہ پر چاہے عوام کو چلائے بھلا جس کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہو اس سے زیادہ پیشوائی کا حق اور کسے پہنچتا ہے۔

معاویہ کو امیر شام کہنا بھی اسی قسم کی مہملیت ہے، کیا اسلامی شریعت کی رو سے جو شخص شام کے علاقہ کا امیر ہوا سے بخشش کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے؟ یہ معاویہ کی فضیلت کا کون سا اضافی پہلو ہے کہ اس پر بغلیں بجائی جائیں۔ معتمد و محبوب ابوبکرؓ و عمرؓ بھی ایک لفظی فریب سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اصل چیز خدا اور رسول کا معتمد و محبوب ہونا ہے۔ اور یہ شرف جس ذات گرامی کو حاصل تھا امیر معاویہ یہ ساری عمر اسکے خلاف بغض کا اظہار کرتے رہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ خیبر میں یہودیوں کا ایک قلعہ جب کئی روز کی مسلسل جد و جہد کے بعد بھی فتح نہ ہو سکا تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو بلا کر یہ مہم انکو تفویض فرمائی۔ اس موقع پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا۔

"غداً اعطی الرایة من یُحِبُّ اللہ وَرَسولہ ویحبہ اللہ وَرَسولہ'

"کل میں علم جنگ اس شخص کے سپرد کرونگا جسے خدا اور رسول سے محبت ہے اور جو خود بھی خدا اور رسول کا محبوب ہے۔"

ہادیٔ اہل سنت اگر امیر معاویہ ہیں تو علیؑ ابن ابی طالب کیا تھے؟ اس لیئے کہ ہادیٔ

اہل سنت صاحب نہ صرف سنت کی برابر مٹی پلید کرتے رہے، بلکہ حضرت علیؑ کی مخالفت انکا عمر بھر کا اثاثہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ سب اہل سنت مل کر اپنے ہادی کی اتباع کرتے ہوئے حضرت علیؑ کا نام اہل سنت کی فہرست سے خارج کردیں۔ ع

چشم ما روشن دل ماشاد

معاویہ کے لیئے "محسن مہدی امت" کا خطاب بھی ایک لفظی بیہودگی سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ البتہ انھیں محسن خاندان بنی امیہ اور مہدی امت ضالہ و باغی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ بنی امیہ کی کشت ویران کے لیئے ان کا وجود ابر نیساں سے کسی طور کم نہ تھا۔ اور ملت اسلامیہ کے باغیوں کے لیئے ان کا دامن حکومت ظل عاطفت ثابت ہوا۔

منبع جود و سخا معاویہ تھے؟ کیا سیاسی رشوت کے طور پر دی جانے والی رقم اور جاگیر جود و سخا ہے یا ملکی خزانہ کا استحصال، کیا یہ خیانت مجرمانہ نہیں ہے؟

انّ اللہ لایحب الخائنین   اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

کیا یہ بات محتاج ثبوت ہے کہ امیر معاویہ نے سیاسی مطلب براریوں کے لئے بیت المال کا بے دریغ استعمال کیا اور رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کے لئے ملکی اور قومی دولت کو بے محابا ضائع کیا حلوائی کی دوکان پر دادا جی کا فاتحہ دلوانے کے لیئے ایک بخیل سے بخیل شخص بھی فوراً آمادہ ہو جائے گا مگر اس سے وہ سخی نہیں بن جائے گا۔

حلم اور ان کی قوت برداشت سیاسی مصلحتوں کی پیداوار تھی جیسا کہ انھوں نے اس کا اظہار عائشہ بنت عثمان کے سامنے کیا۔ عائشہ نے معاویہ سے اپنے باپ کے قاتلوں کا انتقام لینے کا مطالبہ کیا تو انھوں نے اس کے جواب میں کہا تھا:۔

یا بنتا اخی انّ الناس اعطونا طاعة و اعطینا هم اما ناً و

اظهرنا لهم تحته غضب و اظهروا لنا طاعة تحتها حقه .

بھتیجے! لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کی اور ہم نے انھیں جان کی امان بخشی۔ ہم نے اُن سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ حالانکہ ہمارے دلوں میں اُن کے لئے غیظ و غضب کے جذبات ہیں لوگوں نے بھی بظاہر ہماری حکومت کو تسلیم کر لیا ہے لیکن اُن کے دل ہمارے ساتھ نہیں ہیں (طبری)۔ یہ ہے امیر معاویہ کے حلم و بردباری کی حقیقت وہ خود بھی اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ اس حلم کی تہ میں غیظ و غضب چھپا ہوا ہے۔ امیر معاویہ کا حلم اُن کی طبیعت کا جوہر نہ تھا کیوں کہ وہ ایک بزدل انسان تھے اور بزدل کبھی حلیم نہیں ہو تا البتہ وہ ایک شاطر سیاست داں ضرور تھے جو مصلحت وقت کے پینترے بدلتا رہتا ہے ورنہ جہاں تک مخالفوں سے انتقام لینے کا تعلق ہے وہ حد درجہ بے رحم اور قسی القلب واقع ہوئے تھے۔

حضرت عمار بن یاسر جن کے بارے میں حضور نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ایک باغی جماعت انہیں قتل کرے گی جب صفین (ان واقعات کا تذکرہ کتب کے ساتھ پچھلے اوراق میں ہم پیش کر چکے ہیں) کی جنگ میں معاویہ کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے تو اُن کا سر کاٹ کر معاویہ کے پاس لایا گیا جاہلیت کی اس وحشیانہ رسم کو امیر معاویہ نے اختیار کیا کیا حلم ایسا ہوتا ہے؟ خطابات کی اس فہرست میں ایک خطاب "خال المسلمین" بھی ہے یعنی مسلمانوں کا ماموں یہ کون سا عہدہ ہے؟ زاور اگر یہ کوئی اعزاز ہے تو جو لوگ معاویہ کو اپنا ماموں سمجھتے ہیں وہ ہاتھ کھڑا کریں! جن تیرہ بختوں کے مقدر میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ قیامت کے دن شیعیان معاویہ کی صف میں اُن کا حشر ہو وہ امیر معاویہ کی عظمت ثابت کرنے کے لیئے ہر دور میں اس قسم کی مذموم حرکتیں کرتے چلے آئیں ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ اس پر تعجب کا اظہار کیا جائے۔ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں محدث ابن جوزی کی سند

سے یہ واقعہ روایت کیا ہے کہ ابن حنبل سے ان کے فرزند عبداللہ نے حضرت علیؑ اور معاویہ کے متعلق استفسار کیا اس پر احمد بن حنبل نے جواباً فرمایا:

علیؑ ابن ابی طالب کے دوستوں کے مقابلہ میں ان کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی انھوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ حدیث نبوی میں سے کوئی ایسی بات نکالیں جس سے ذات علیؑ پر حرف گیری کر سکیں جب انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو انھوں نے حضرت علیؑ کے دشمنوں کی تعریف میں مبالغہ آرائی شروع کر دی اور من گھڑت باتیں بیان کرنے لگے تاکہ اس ہتھیار سے حضرت علیؑ کی شان میں تنقیص کا پہلو نکال سکیں۔

بنا بریں ان القاب و خطابات کو تو چھوڑیے کہ ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اگر کسی حدیث میں معاویہ کی فضیلت کا کہیں کوئی تذکرہ ملتا ہے تو وہ بھی سراسر مصنوعی اور جعلی حدیث ہے۔ مشہور محدث نسائی جن کی کتاب حدیث کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے انکی وفات شہادت آیات کا واقعہ کتب تاریخ میں مذکور ہے کہ جب وہ دمشق پہنچے تو وہاں بنی امیہ کے کچھ لوگوں نے ان سے معاویہ کی فضیلت کے باب میں کوئی حدیث سنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے فرمایا "تم فضیلت کی بات کرتے ہو اگر وہ برابر برابر چھوٹ جائیں تو یہ بھی بڑی بات ہے مگر لوگوں کا اصرار قائم رہا اس پر امام نسائی نے یہ روایت بیان کی کہ۔

"ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر معاویہ کو بلا بھیجا۔ انھوں نے کہا میں کھانا کھا کر آرہا ہوں۔ کچھ وقفہ کے بعد حضورؐ نے دوبارہ قاصد بھیجا۔ معاویہ نے وہی پہلا سا جواب دیا۔ سہ بارہ حضورؐ نے ان کو پیغام بھیجا۔ تب بھی اس نے یہی کہا کہ میں ابھی کھانے سے فارغ نہیں ہوا۔

یہ سن کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

لا اشبع الله بطن معاويه الله　　معاویہ کا پیٹ کبھی نہ بھرے

بنی امیہ کے لوگوں نے امام نسائی کی زبان سے یہ حدیث سنی تو مشتعل ہو کر ان پر پل پڑے۔ ان پر سنگ باری کی اور انھیں اس قدر زدوکوب کیا کہ اسی صدمہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ (''ترجمان السنۃ'' از بدر عالم میرٹھی۔ ناہید عن ذم معاویہ العبد العزیز فرہاروی)

ہمیں تو آج تک یہی تعجب ہے کہ امام نسائی کی اس روایت کے بعد جو انھوں نے ہادی اہل سنت کے بارے میں پیش کی۔ اہل سنت ان کی اس کتاب کو اپنے مدارس دینیہ کے درس نظامی میں شامل کرنے کے روادار ہوئے تو کیونکر ہوئے؟

امام نسائی کی یہ روایت ایک شہادت ہے اس امر واقعہ کی کہ معاویہ اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کا اسلام محض دفع الوقتی کے لیئے تھا۔ ان کے دلوں میں نہ حضورؐ کے لیئے جذبات عقیدت و احترام تھے نہ اسلام ہی سے ان کو کچھ واسطہ تھا ایک نامور مسلمان مورخ ابو حنیفہ دینوری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاخبار الطوال'' میں حضرت علیؑ کے ایک خطبہ کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے جنگ کے موقع پر دیا۔ آپ نے فرمایا تھا۔

''ایھا الناس سیروا الیٰ اعداء السنن والقرآن سیروا الیٰ قتلة المھاجرین والانصار سیروا الیٰ الجفاة الطغام الذین کان اسلامھم خوفاً وکرھاً سیروا الیٰ المولفة قلوبھم لیکفوا عن المسلمین باسھم''

لوگوں دشمنان قرآن وسنت کے خلاف جنگ کرنے کے لیئے تیار ہو جاؤ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مہاجرین وانصار کو قتل کیا۔ یہ وہ ظلم پیشہ و بدکار لوگ ہیں جن کا اسلام دفع الوقتی کیلیئے اور محض ڈر کی وجہ سے تھا۔ یہ مارے باندھے کے مسلمان ہیں تا کہ انکی چیرہ دستیوں

سے محفوظ رہ سکیں اور ان کے ظلم کا سدِ باب کیا جا سکے۔

کیا معاویہ حضرت علیؑ کے اس خطبہ کے مندرجات کے صحیح مصداق نہیں تھے؟ اس کا جواب ہر مسلمان کو پوری دیانتداری کے ساتھ دینا چاہیئے۔ ایک عرب عیسائی مورخ جرجی زیدان نے اپنی کتاب ''تاریخ التمدن الاسلامی'' میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور لکھا ہے۔

ابوسفیان اور اسکی اولاد نے اسلام اس وقت قبول کیا جب وہ اپنی کامیابی سے مایوس ہو گئے معاویہ کی خلافت کے لیئے کوشش نری دنیا طلبی کے لیئے تھی اموی خلافت خالصتاً دنیاوی حکومت تھی۔ خلیفہ مکر و سیاست سے حکومت کرتا تھا اور لوگوں کو دہشت سے اپنا ہمنوا بناتا تھا اور روپیہ صرف کر کے اپنی حکومت مضبوط کرتا تھا اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کے بانی ''امیر معاویہ کا مقصد خلافت سے آخرت کی کامیابی نہ تھا۔

معاویہ نے ایک مرتبہ حضرت علیؑ کے نام ایک انتہائی گستاخانہ مکتوب ارسال کیا تھا جسمیں اپنی فوجی برتری اور سیاسی اہمیت کا بطور خاص تذکرہ کیا تھا۔ اس کے جواب میں امیر المومنین سیّدنا علیؑ ابن ابی طالب نے جو مکتوب تحریر فرمایا وہ جرجی زیدان کی محولہ بالا عبارت کی تصدیق کرتا ہے آپ نے لکھا تھا۔

''متیٰ کُنتم یا معاویه سادة الرعیة ولاة امر الامة بصیر قدم سابق ولا شرف ونعوذ بالله من لنوم سوابق الشبقاء واحذرك ان تكون متماديانی عزة الامنية مختلف العلا نيهم والسريرة وقد دعوت الى الحرب فدمر الناس جانباو اخرج الیٰ ناعف الفریقین منالقتال لیعلم ایما المرین علیٰ قلبة والمعض علیٰ بصره فاناابو حسن قاتل جدك وخالك واخيك شلخا يوم بدر وذالك السيف معی و بذلك القلب

القیٰ عدوی ما استبدلت دینا ولا استحدثت نبیاً وانی لعلی منهاج الذی ترکتموہ طائعین ودخلتم فیہ مکرھین"

معاویہ! یہ تم لوگ کب سے رعایا کے حکمراں اور اس امت کے معاملات کے نگراں بن گئے ہو جب کہ نہ تمہارا نام سابقین کی فہرست میں شامل ہے نہ تمہیں ہجرات اور اعانت اسلام کا شرف حاصل ہے، پناہ بخدا وہی پرانی بدبختی آج بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے۔ میں تمہیں انتباہ کرتا ہوں کہ خوش فہمیوں کی جنت میں رہنا چھوڑ دو اور ظاہر و باطن کے نفاق سے باز آجاؤ اور وہاں تم نے مجھے جنگ کے لیئے للکارا ہے اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ عامۃ الناس کو ایک طرف کر دو۔ فوجیں ہٹالو اور پھر خود میرے مقابلہ میں آؤ تاکہ لوگوں کو پتہ چل سکے کہ کسی کا دل زنگ آلود اور کس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے، میں وہی ابوالحسنؑ ابن ابی طالب ہوں جس نے جنگِ بدر کے دن تمہارے نانا، ماموں اور بھائی کو ذلت و رسوائی کی موت سے ہمکنار کیا تھا، وہی تلوار آج بھی میرے قبضہ میں ہے اور وہی جرأت مند دل آج بھی میرے پہلو میں ہے جس سے میں دشمنوں سے نپٹتا رہا ہوں، میں نے نہ تو اپنا مذہب تبدیل کیا ہے نہ پیغمبر اسلام کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہے میں آج بھی اس مسلک پر گامزن ہوں جسے تم نے جب تک تمہارا بس چلا چھوڑے رکھا اور جب مجبور ہو گئے تو باول ناخواستہ اسے قبول کرلیا۔

اس مکتوب گرامی میں ایسی کون سی بات ہے جو خلاف واقعہ ہو؟ کیا معاویہ اور ان کے باپ فتح مکہ کے روز مسلمان نہیں ہوئے؟ کیا ان لوگوں کی زندگیوں کا بیشتر حصہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت میں بسر نہیں ہوا؟ کیا فتح مکہ سے ایک دن پہلے تک ان لوگوں نے اپنی سی کوشش نہیں کی کہ حضور کو زک پہنچائیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس مدت کے اندر انکی ایسی

کایا پلٹ جائے کہ اسلام ان کے دلوں میں رچ بس گیا؟

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جب ان کے سامنے اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا تو انھوں نے اسلام کا ڈھونگ رچالیا۔

یزید پلید

ھر کہ بد گفت خلافت ماط ۔۔۔ ہست لوے گمل یزید پلید

یزید ابن معاویہ کے بارے میں کوئی غیرت مند اور باشعور مسلمان یہ تصور تک نہیں کرسکتا کہ اس شخص کا اسلام سے کوئی دور کا تعلق بھی تھا یا اس کے دل میں خوف خدا اور محبت رسول کا شائبہ تک موجود تھا۔ اگر واقعہ کربلا ظہور میں نہ آتا جیسا کے بعض بدنہاد و بدفطرت اور ابن بابا محققین نے اس حادثۂ فاجعہ کو ایک فرضی اور خود تراشیدہ افسانہ کہنا شروع کیا ہے تاکہ یزید کے داغ دھبّوں کو دور کرکے اسے بے داغ انسان کیا جائے اور چاہتے ہیں کہ امت اسلامیہ عزیمت و جرائت اور ہمت و استقامت کی اس تابناک روایت کو فراموش کردے جسے حسین ابن علیؑ نے اپنے اور اپنے خاندان کے خون سے تاریخ کے اوراق پر ثبت کیا ہے۔ اب بھی یزید کی روسیاہی اور اسکی تیرہ باطنی کے لیئے یہ بات کافی ہے کہ اس کے حکم سے تین روز تک مدینۂ رسولؐ کی حرمت کو تاراج کیا جاتا رہا، جنگ و ماہ قتل و غارت گری اور حرمات الٰہیہ کی پامالی اس کے ایماء پر روبہ عمل لائی گئی اور لوٹ مار کا وہ بازار گرم کیا گیا جس سے تو قع کسی غیر مسلم سے بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

اصحاب ظواہر کے امام اور پانچویں صدی ہجری کے ایک زبردست عالم علامہ ابن حزم اندلسی جنکے بارے میں شیعت کا گمان تک نہیں کیا جاسکتا بلکہ جنھوں نے اپنی مشہور کتاب

"الملل والنحل" میں شیعہ عقائد کا بڑی سختی سے رد کیا ہے، اور اصحاب ثلاثہ کی عظمت و فضیلت پر زوردار دلائل پیش کیئے ہیں۔۔ وہ اپنی کتاب "جمرۃ النسب" میں یزید ملعون کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"وكان قبيح الآثار فى قتل اهل المدينه و افا ضل النا س و بقية الصحابه رضى الله عنهم يوم الحرة فى آخر دولته وقتل الحسين رضى الله عنه و اهل بيته فى اول دولته و حاصر ابن زبير رضى الله عنه و اهل مكة فى المسجد الحرام واستغن بحرمة الكعبة و الا سلام ماته الله فى تلك الا يام "

اسلام میں وہ بہت برے آثار کا شخص گذرا ہے اپنی حکومت کے آخری دور میں اُس نے مدینہ منورہ میں لوگوں کا قتل عام کیا اور بڑے بڑے اہل علم و فضل اور بچے کھچے صحابہ کو شہید کرا دیا اور اپنے اقتدار کے ابتدائی ایام میں حضرت حسینؓ اور اُنکے خاندان کے افراد کو شہید کروادیا اس نے حرم کعبہ میں عبداللہ ابن زبیر اور دیگر باشندگان مکہ کا محاصرہ کیا کعبۃ اللہ کی توہین کا مرتکب ہوا اسلام کی عظمت کو اُس نے بری طرح پامال کیا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے دنیا سے اُٹھا کر اس کے فتنہ سے لوگوں کو نجات دلائی۔

اس ملعون انسان کے فسق و فجور اور اس کی کفر طرازیوں پر ہمیشہ سے اُمت کا اجماع چلا آرہا ہے اور ملت اسلامیہ کا اُس کے بارے میں متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ ایک بدکار اور ظالم و جابر حکمران تھا تاریخی واقعات سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ اہل مدینہ کی جانب سے یزید کے فسق و فجور کی بنا پر جب اس کی حکومت سے برأت کا اظہار کیا گیا تو یزید نے مسلم ابن عقبہ المزی کو ۱۲ ہزار فوج دیکر مدینہ پر چڑھائی کا حکم دیا اور اُسے ہدایت کی کہ مدینہ

پر قبضہ کرنے کے بعد تین دن کے لئے فوج کو کھلی چھٹی دے دینا چنانچہ ان تینوں دنوں میں عوام کا قتل عام کیا گیا اور عورتوں کی عصمتیں بے دریغ لوٹی گئیں۔ بچوں کو اُٹھا اُٹھا کر دیواروں سے دے مارا گیا بوڑھی صحابیات تک سے زنا بالجبر کیا گیا اور ہر وہ ظلم اہل مدینہ پر روا رکھا گیا جس کے تصور سے انسانیت لرزہ براندام ہو جاتی ہے (طبری ج ص تا ص ۲۰۹ ابن الاثیر ج ۳ ص ۳۱۰ تا ۳۱۴ البدایۃ والنہایہ ج ۸ ص ۲۱۹ تا ۲۲۱) معاذاللہ! یزید کی خاندانی روایات کا تصور کیجیے اور پھر عرب قوم کی ذہنی اور سیاسی کیفیت کا جائزہ لیجیے تو ایک بات واضح ہو کر آپ کے سامنے آجائے گی کہ یزید نے اپنے عہد اقتدار میں جو ظالمانہ اقدامات کئے وہ اس کے خاندان کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جسے یزید نے پایہ تکمیل تک پہنچایا یعنی جو کام یزید کے دادا ابوسفیان نہ کر سکے اور جس کی تکمیل کی حسرت لئے معاویہ دنیا سے رخصت ہو گئے اُس کام کو ابوسفیان فرزند ارجمند نے پورا کیا۔

عرب کے شتربانوں میں شتر کینگی کا جذبہ بڑی شدت کے ساتھ کارفرما تھا امتداد وقت کے اور مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ مردہ نہیں پڑا تھا بلکہ دو آتشہ اور سہ آتشہ ہوتا چلا جاتا تھا معاویہ کی ماں اور ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت ربیعہ نے جنگ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عم گرامی قدر سید الشہداء حضرت حمزہ کی شہادت کبریٰ کے بعد جس طرح ان کے جسد اطہر کا مثلہ کیا۔ ان کے اعضاء رئیسہ کا ہار بنا کر گلے میں ڈالا اُن کے جگر کو دانتوں سے چبایا اور اُن کا خون پی کر اپنے انتقام کی آگ بجھائی وہ اس شتر کینگی کا ایک ادنیٰ مظاہرہ تھا! معاذاللہ۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر سوچیے کہ ابوسفیان کو اس امر کا کتنا صدمہ تھا کہ بنو امیہ کے حریف قبیلہ بنو ہاشم کے ایک فرد فرید نے مدینۃ المنورہ جا کر اپنی قوت کو مجتمع کیا اور اُس

قوت کے بل پر مکہ فتح کر لیا اور ابوسفیان کی سرداری حرف غلط کی طرح مٹ گئی اس کی رئیسانہ عظمت ملیامیٹ ہو گئی اور بنو امیہ کی شان و شوکت حضورؐ کے قدموں کی ٹھوکر کے سامنے ریت کا گھروندا ثابت ہوئی عرب کی بساط سیاست و اقتدار پر ابوسفیان اور اُس کے قبیلے نے جو شہ مات کھائی اس کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا تھا کہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے خاندان کو تہ تیغ نہ کیا جائے بلکہ مدینہ کے باسیوں کا قتل عام کیا جائے اُن کی بہو بیٹیوں کی عصمت و ناموس کو بے دریغ لوٹا جائے اور آئندہ بنو ہاشم کے کسی فرد کو مسند اقتدار پر متمکن ہونے کے تمام مواقع ختم کر دیے جائیں۔

ابوسفیان کے اس ناپاک منصوبہ کو اُس کے پوتے یزید لعین نے عملی جامہ پہنایا اور ثابت کر دیا کہ بنو امیہ کا قبول اسلام محض ایک دھوکا تھا تاریخ میں یہ واقعہ ملتا ہے اور اسی بنا پر ابوسفیان کا منصوبہ کوئی فرضی چیز نہیں ہے بلکہ ایک طے شدہ امر ہے کہ جب عثمان بن عفان خلیفہ بنے تو ابوسفیان جو اس وقت اندھا ہو چکا تھا عثمان کے پاس آیا اور بڑی رازداری سے یہ کہا کہ اب جب کہ اللہ نے تمھیں مسند اقتدار پر متمکن کر دیا ہے تو تم بنی امیہ کے قدم اسقدر مضبوط کر دو کہ اگر کوئی شخص انھیں اقتدار سے ہٹانا بھی چاہے تو نہ ہٹا سکے ابوسفیان نے جو مشورہ عثمان بن عفان کو دیا تھا اُس کے الفاظ یہ تھے۔

اِجعل بنی امیہ اوتاد الارض۔ بنی امیہ کو اسلامی مملکت کی حدود میں میخوں کی طرح گاڑ دو۔

ابوسفیان کا یہ مشورہ حضرت عثمان کے حلق کے نیچے اتر کر ان کے دل میں اس طرح پیوست ہو گیا کہ پھر وہ عمر بھر اس پر کاربند رہے۔ انھوں نے بنی امیہ کے ہر شخص کو بغیر اس امتیاز کے کون لائق تھا اور کون نالائق کون نیک تھا اور کون بد، کون ان کا قریبی عزیز تھا اور کس سے

ان کی دور کی رشتہ داری تھی، کون اہل تھا اور کون نااہل، گورنریاں اور اس قسم کی تمام بڑے [illegible] آنکھیں بند کر کے تقسیم کر دیے۔

جب کوفہ کی گورنری سے سعد ابن ابی وقاص کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنے خالہ زاد بھائی عقبہ ابن ابی معیط کو انھوں نے گورنر مقرر کیا تو سعد بن ابی وقاص نے حضرت عثمان سے اپنی برطرفی کی شکایت کی اس پر اسلام کے نظام خلافت و شورائیت کے اس مسند نشین نے جواب باصواب مرحمت فرمایا وہ ان کے عزائم کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے کہا:

"انما هو ملك يتغداه و يتعشاه اٰخرون"

فرمان روائی میں تو یہی کچھ ہوتا آیا ہے کہ بادشاہت صبح کو کسی کے قبضہ میں اور شام کو کوئی اور اس پر قابض ہو گیا۔

اس پر سعد بن ابی وقاص کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آخر کہا تو یہ کہا۔

اریتم جعلتمو ھا ملکاً اچھا تو تم نے اسے بادشاہت کی شکل دے دی ہے

(طبری۔ ابن سعد)

یاد رہے کہ سعد بن ابی وقاص "عشرہ مبشرہ" میں سے تھا اور ان کی جگہ جسے گورنر بنایا گیا وہ ایک فاسق و فاجر اور بدکردار شخص تھا اس کے بارے میں مرقوم ہے کہ وہ شراب کے نشہ میں بے دھت امامت کراتا تھا اور کسی کو مجال دم زدن نہ تھی کہ امیر المومنین کے اس خالہ زاد بھائی کا محاسبہ کر سکے۔

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

دشتِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ نے عزیمت و جرائت، ہمت و استقامت اور ایثار و قربانی کا جو شاندار اور غیرت مندانہ مظاہرہ فرمایا وہ تاریخ میں حق و صداقت کا ایک درخشاں باب ہے۔ اور ایک ایسی ایمان افروز اور روح پرور داستانِ عبرت و عظمت ہے جس سے حق گوئی بے باکی جانفروشی، پامردی اور بے نفسی کی روایات ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں گی۔ اگر یہ واقعہ سرے سے وجود میں نہ آیا ہوتا اور اسکی حیثیت محض ایک لوک کہانی کی سی ہوتی جب بھی یہ دردناک واقعہ اس امر کا حقدار تھا کہ سال میں چند ایک مخصوص ایام اسکی یاد تازہ رکھنے کے لیئے وقف کر دیے جاتے کہ یہ کہانی ایک ایسے شخص کی عظمت کا پتہ دیتی ہے جس نے اپنا گھربار، اپنی عزت و آبرو، اپنا خاندان، اپنے اہل و عیال، اپنے خویش و اقارب، اپنی جان و مال، غرضیکہ اپنا سب کچھ حق و صداقت کے لیئے عزتِ نفس اور پاس ناموس کے لیئے اور اسلام کے قانون، عدل کے تحفظ کی خاطر قربان کر دیا۔ حق و صداقت کی سربلندی کے لیئے کسی مظلوم کے حلق سے نکلی ہوئی ایک چیخ ہزار ہا ہزار برس کی عبادت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

حضرت سیدنا حسینؓ ابن علیؓ نے یزید کے مقابلہ میں جو موقف اختیار فرمایا وہ اسلام کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ اسلام رخصت و عزیمت کے دوراہے پر اپنے حلقہ بگوشوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ رخصت کے آسان راستے کو چھوڑ کر عزیمت اور صبر و استقامت کی کٹھن و دشوار گزار راہ کے جادہ پیما ہوں گے، اسلام مداہنت اور مصلحت کوشی کا قائل نہیں ہے وہ حق و باطل کی کشمکش میں اپنے ہر پیروکار سے علانیہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ حق کا ساتھی بنے اور باطل کو ٹھکرا دے اس کے یہاں جاں طلبی کی واضح ہدایت تو ملتی ہے مگر وہ مصلحت کیشی کو گناہ عظیم

گردانتا ہے۔ حق سے غیر مشروط وفاداری اور باطل سے بیزاری کا یہی وہ سبق ہے جو حضرت امام حسینؓ کی زندگی اور انکی شہادت عظمیٰ کے واقعہ سے حاصل ہوتا ہے تاریخ بہت پہلے اپنا فیصلہ صادر کر چکی ہے کہ حسینؓ شہید حق و صداقت ہیں، مظلوم دشتِ کربلا ہیں، قتیلِ ظلم و جور ہیں، اور انکا حریف یزید فاسق و فاجر تھا، بدکردار تھا، ظالم تھا اور اس لیئے خدا کی دائمی لعنت کا مستحق ہے۔

ہر دور میں ملعون شقاوت ہے شمر کی
ہر عہد میں مسعود ہے قربانی شبیرؓ

جو لوگ آج ساڑھے تیرہ سو برس بعد تاریخ کے اس اٹل فیصلے کو بدلنے کے لیئے اٹھے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی یہ کوشش رائگاں جائیگی۔

شاعرِ مشرق عظیم اسلامی مفکر اور مملکت عزیز پاکستان کے تصور کے خالق علامہ اقبالؒ نے شہادت حسینؓ کے فلسفہ اور ہماری تاریخ علم پر اس دور رس اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اگر ناقدین حسینؓ صرف اس کا مطالعہ کر لیں اس میں بصیرت کا کافی کچھ درس موجود ہے۔

اقبالؒ کہتا ہے اور خوب کہتا ہے۔

ہر کہ پیماں با ہوالموجود بست
گردنش از بند ہر معبود رست

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکن ما ممکن است

عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگاں، باز میدان عمل

عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است

عشق را آرام جاں حریت است
ناقہ اش را ساربان حریت است

آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد
عشق را عقل ہوس پرور چہ کرد

آں امام عاشقاں، پر بتولؓ
سرو آزادے ز بستان رسولؐ

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر

بہراں شہزادۂ خیرالملل
دوش ختم المرسلینؐ نعم الجمل

سُرخ رو عشق غیور از خون او
شوخی ایں مصرع از مضمون او

درمیان امت آں کیواں جناب
ہمچو حرف "قل ہو اللہ" در کتاب

موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوۂ خیرالامم
چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

بر زمین کربلا بارید ورفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید ورفت

تا قیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد

بہر حق درخاک وخوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الہ گردیدہ است

مدعایش سلطنت بودے اگر
خود نہ کردے با چنیں سامان سفر

دشمناں چوں ریگ صحرا لا تعد
دوستان او بہ یزداں ہم عدد

سرّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود

عزم اوچوں کوہساراں استوار
پائیدار و تندسیر و کامگار

تیغ بہر عزت دیں است وبس
مقصد او حفظ آئین است وبس

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

خون او تفسیر ایں اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد

تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید
از رگ ارباب باطل خوں کشید

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

رمز قرآں از حسینؑ آموختیم
ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم

شوکت شام و فر بغداد رفت
سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت

تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

اے صبا اے پیک دور افتادگاں
اشک ما بر خاک پاک او رساں

اسلام کا نظام حکومت

اسلام کے نظام سیاست میں فرماں روائی کا حق اللہ اور اُس کے رسولؐ کو حاصل ہے اس کے اس کے بعد یہ حق پیغمبر کی اولاد کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اولاد نرینہ کی عدم موجودگی میں پیغمبر کا قریب ترین عزیز اس منصب سے سرفراز کیا جاتا رہا ہے، بشرطیکہ وہ پیغمبر کی تعلیمات پر صدق دل سے یقین رکھتا ہو اور ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو قرآن مقدس میں دعوت انبیا کا ذکر دسیوں جگہ آیا ہے اور بیشمار آیات اس امر پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ منصب نبوت وامامت کی وراثت ہمیشہ ارباب نبوت میں مرتکز رہی ہے نبوت ورسالت نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی خانوادہ رشد وہدایت میں منتقل ہوتا رہا ہے آدم سے لیکر نوح تک اور نوح سے لیکر ابراہیم تک کے واقعات پردۂ خفا میں ہیں تاہم اس امر واقعہ سے انکار ممکن نہیں ہیکہ نبوت وامامت ایک ہی خاندان میں جاری وساری رہی قرآن مقدس کہتا ہے۔

ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوحاً وال ابریہم وال عمران علیٰ

العالمین ذریة بعضهامن بعض۔

بلاشبہ اللہ نے آدم کو، نوح کو، ابراہیم کے خاندان اور عمران کی اولاد کو تمام کائنات میں برگزیدہ فرمایا۔ یہ چاروں گھرانے ایک ہی سلسلہ نسب کی مختلف شاخیں ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بعثت تاریخ کی روشنی میں ہوئی جن دنوں اُن کے یہاں اولاد نرینہ نہیں تھی اُن کے خواہرزادہ حضرت لوط علیہ السلام کو منصب نبوت عطا کیا گیا اور جب اللہ نے ابراہیم کو دو بیٹے عطا فرمائے تو نبوت کی مسند پر دونوں بیٹوں کو فائز کیا گیا ایک عہد خداوندی تھا جو ابراہیم کی گرانقدر خدمات کے صلہ میں اُن کے ساتھ طے پایا تھا۔

واذابتلیٰ ابرہیم ربه بکلمات فاتمهن قال انی جاعلك للناس اماماًقال ومن ذریتی قال لا ینال عهدی الظالمین۔ (سورۂ آل عمران)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابراہیم کی اُن کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمائش کی وہ ہر امتحان میں کامیاب گزرے تب اُن کے پروردگار نے فرمایا" میں تجھے نسل انسانی کا امام مقرر کر رہا ہوں ابراہیم نے عرض کی" کیا میری اولاد بھی اس اعزاز سے نوازی جائے گی؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہاں! اگر ظالم لوگ اس سے محروم رہیں گے۔ اس عہد کے مطابق حضرت ابراہیم کے فرزند ارجمند اسمٰعیل کو بھی نبوت عطا ہوئی اور اسحاق کے بیٹے یعقوب کے فرزند یوسف کو اس نعمت عظمٰی سے نوازا گیا۔

فقد اٰتینا اٰل ابراهیم الکتاب والحکمة واٰتینا هم ملکاًعظیماً (سورۂ بقرہ)

تو ہم نے ابراہیم کے خاندان کو نبوت اور کتاب عطا فرمائی اور انھیں ایک عظیم الشان مملکت کی حکمرانی سے نوازا۔

حضرت یعقوب جن کا دوسرا نام اسرائیل بھی ہے اُن کی اولاد میں سلسلہ وار انبیاء مبعوث ہوئے اس موضوع پر سب سے جامع آیت جس میں تقریباً تمام مشاہیر انبیاء کا ذکر آ گیا ہے کہ تمام پیغمبر ایک ہی خانوادہ ارشاد و ہدایت کے چشم و چراغ تھے سورۂ انعام کی اس آیت میں پیغمبروں کے نام گنوانے کا بعد ارشاد فرمایا:۔

ومن اٰبائهم وذریاتهم و اخوانهم واجتبیناهم وهدیناهم الیٰ صراطمستقیم (سورۂ انعام)

ان انبیاء و رسل کے آباؤ اجداد ان کی اولاد اور انکے بھائیوں کو بھی ہم نے نبوت سے سرفراز کیا۔ انھیں برگزیدگی کا شرف بخشا اور انھیں جادۂ مستقیم پر گامزن کیا۔

ایک دوسری آیت میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔

"اُولٰئِكَ الَّذِینَ اَنعمَ اللّٰه عَلَیهِم مِنَ النَّبِیّنَ مِن ذُرِّیَّتِ آدمَ وَ مِمَّن حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَّمِن ذُرِّیَّتِ اِبراهِیمَ وَ اِسْرَائِیلَ مِمَّنْ هَدَینَا وَ اجْتَبَیْنَا.

(سورۂ مریم پ ۱۶)

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے نبوت کے انعام سے بہرہ ور فرمایا۔ ان میں آدمؑ کی نسل کے لوگ اور نوحؑ کے ساتھی اور ابراہیمؑ اور یعقوبؑ اولاد شامل ہے ہم نے انھیں ہدایت دی اور انھیں برگزیدگی کا شرف بخشا۔ (سورہ مریم پ ۱۶)

حضرت شعیبؑ کے یہاں اولاد نرینہ نہیں تھی اللہ تعالیٰ نے ان کے داماد موسیٰ علیہ السلام کو خلعت نبوی سے سرفراز فرمایا۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارونؑ کے لیئے بارگاہ خداوندی میں استدعا کی چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست کو شرف قبولیت عطا کیا گیا۔

"اجعل لی وزیراً من اهلی هارون اخی اشدد به أزری واشرکه فی امری کی نسبحك کثیراً و نذکرك کثیراً انك کنت بنا بصیر قال قد اوتیت سئولك یا موسیٰ۔

خدایا! میرے خاندان سے میرے بھائی ہارونؑ کو میرا مددگار اور معاون بنا تا کہ ہم دونوں مل کر تیری عزت وقدوسیت کے ترانے گائیں اور تیری یاد سے اپنے دلوں کو منور کریں بے شک تو ہمارا نگراں ہے، خداوند قدوس نے فرمایا۔ اے موسیٰ! تمہاری درخواست کو شرف قبولیت سے نوازا گیا۔ (سورہ طٰہٰ ۲۰، ۲۸)

حضرت داؤدؑ کو نبوت وسلطنت یکجا دی گئی۔ داؤد علیہ السلام کے بعد ان کے وارث ان کے فرزند گرامی حضرت سلیمانؑ ہوئے۔

"ولقد اٰتینا داؤد و سلیمان علماً و قال الحمد للّٰه الذی فضلنا علیٰ کثیر من عبادہ المومنین و ورث سلیمان داؤد"

بلاشبہ ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم کی دولت عطا فرمائی اور داؤدؑ نے تحدیث نعمت کے طور پر کہا اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے ایماندار بندوں پر برتری عطا فرمائی پھر سلیمانؑ وارث ہوئے داؤدؑ کے۔ (سورہ سبا، پ ۱۹)

حضرت ذکریاؑ نے بڑھاپے میں ایک وارث کی تمنا کی اور خدائے قدوس نے انکی اس تمنا کو پورا کر دیا۔

"کھٰیٰعص" ذکر رحمت ربك عبدہ ذکریا اذنا دی ربه ندا خفیاً قال رب انی وھن العظم منی واشتعل الراس شیبا ولم اکن بد عائك رب شقیاوانی خفت الموالیٰ من ورائی و کانت امراتی عاقراً

فھب لی من لدنك ولیایرثنی ویرث من ال یعقوبؑ واجعله رب رضیاً یا زکریا انا نبشرك بغلام اسمه یحیٰ لم نجعل له من قبل سمیا۔

(سورۂ مریم ۱۶/۷)

یہ تذکرہ ہے اس رحمت وعنایت کا جو تیرے پروردگار نے اپنے بندے ذکریا پر فرمائی۔ جب اس نے اپنے رب سے مناجات کی اور عرض کیا کہ بارالہا! میری ہڈیوں کا زور گھٹ گیا ہے اور میرے سر کے بال بڑھاپے کے سبب سفید ہو گئے ہیں تاہم میں تجھے پکارنے کے بعد بدنصیب نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنے خویش واقارب سے اندیشہ ہے اور میری بیوی بھی ناکارہ ہو چکی ہے، اس لیئے اپنے خصوصی لطف وکرم سے مجھے ایک وارث عطا فرما جو میرا اور آل یعقوبؑ کی عظمت کا امین ہو، اور تیرا مقبول بارگاہ ہو، حق تعالیٰ نے فرمایا، اے ذکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں۔ اس کا نام یحیٰی ہوگا۔ اس سے پہلے اس نام کا کوئی بچہ نہیں گزرا۔

مزکورۃ الصدر آیات میں ذریت، آل، اہل، آبا اور اخوان کے الفاظ جابجا استعمال ہوئے ہیں۔ قران مقدس میں ایسی کئی اور آیات بھی ہیں جن میں یہی مضمون انھی الفاظ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ذریت کے لغوی معنی اولاد ہیں جب کے آباء سے مراد باپ دادا ہیں۔ آل اور اہل کا اطلاق خاندان اور برادری پر ہوتا ہے اور اخوان سے بھائی، بند مراد ہیں۔ ان آیات کی رو سے پیغمبر کی روحانی وراثت کا امین اسی کے اہل بیت میں سے کسی مستحق فرد کو ہونا چاہئے، یہ قانون الٰہی اور سنت اللہ ہے لیکن حالات کی یہ عجیب افتاد رونما ہوئی کہ جب خدا کے آخری پیغمبر کی وراثت کا سوال درپیش ہوا تو یہ عجیب وغریب اُصول وضع کر لیا گیا کہ نبوت وراثت کی متحمل نہیں ہوتی۔

حضرت ابو بکرؓ کی روایت:

نحن معا شر الانبیاء لا نرث ولا نورث

ہم گروہ انبیاء نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں نہ کسی کو اپنا وارث بناتے ہیں۔

پر اگر اجماع امت بھی ہو جائے جب بھی ایک مسلمان کے اعتقاد کے بموجب امت کا اجماع کسی قرآنی آیت کو منسوخ نہیں کر سکتا، نہ حدیث میں یہ طاقت ہے کہ وہ قرآن کی کسی آیت کو معطل کرا سکے۔ قرآن مقدس اپنی آیات کے مفہوم کی وضاحت کے لیے نہ کسی ابو بکر کا محتاج ہے نہ کسی عمر کا، قرآن کی وہ کون سی آیت ہے جس کی رو سے وراثت کے حق کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذوی القربیٰ اور اہل بیت نبوت کے لیے منسوخ کیا گیا۔

یہاں بعض جاہل لوگوں کے اس اعتراض کا بھی دفعیہ ضروری ہے کہ پیغمبر کا وارث پیغمبر تو ہو سکتا ہے لیکن جہاں کوئی پیغمبر موجود نہ ہو وہاں پیغمبر کی جانشینی کا مسئلہ امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جسے چاہے نامزد یا منتخب کرے۔ دراصل یہ بات ایک بے بنیاد بحث بازی کے سوا کچھ نہیں۔ نبوت بلاشبہ ختم ہو چکی ہے لیکن سلسلۂ امامت ختم نہیں ہوا اور جب تک دنیا میں ابراہیم علیہ السلام کی ذریت موجود ہے امامت کا سلسلہ منقطع نہیں ہو سکتا، نبوت و امامت میں فرق مراتب ضرور ہے لیکن حقوق و فرائض میں چنداں فرق نہیں ہے دونوں کا مدعا ایک ہے۔ ہر پیغمبر نبوت اور امامت دونوں کا جامع ہوتا ہے۔ نبوت کی طرح امامت کا سرچشمہ بھی محبت الٰہی اور عطیۂ خداوندی ہے۔ نبوت اکتسابی شئے نہیں ہے اسی طرح امامت کا منصب بھی اکتسابی نہیں، وہبی ہے۔ قرآن مقدس میں کئی جگہ امامت کا تذکرہ ملتا ہے اور ہر موقعہ پر قرآن مقدس نے یہی تاثر دیا ہے کہ کسی کو امام بنانا نہ بنانا قطعاً خدا کی مرضی اور صوابدید پر منحصر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ سے خطاب ہوا۔

انی جاعلك للناس اماماً۔ میں تجھے نسل انسانی کا امام بنا رہا ہوں

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

وَجعلنا هم آیمة یهدون بأمرنا لمّا صبروا

ہم نے انھیں راہ حق میں ان کے صبر و استقامت کے صلے میں منصب امامت پر سرفراز کیا کہ لوگوں کو راہ راست کی طرف بلائیں۔

ان آیات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ نبوت کی طرح امامت کا منصب بھی کسی شخص کو خدا ہی کی جانب سے تفویض ہوتا ہے۔ اس پر لفظ "جعلنا" اور "جاعل" دلالت کرتے ہیں جیسا کہ ایک اور مقام پر فرمایا:

الله اعلم حیث یجعل رسالته

اللہ بہتر جانتا ہے جسے وہ اپنی رسالت کے لیے منتخب فرماتا ہے۔

ایک غلط پروپگینڈا!

یہاں اس پروپگینڈے کی تردید بھی ضروری ہے کہ "اسلام جمہوریت کا علمبردار ہے اور جمہوری روایات کے مطابق ابو بکرؓ کی خلافت برحق تھی کیونکہ انھیں جمہور نے بیعت عام نے منتخب کیا تھا چونکہ آج کل متجددین اور مغرب زدہ حضرات نے اس پروپگینڈہ مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے کہ اسلام جمہوری نظام حکومت کا داعی ہے اور نقیب ہے" اور اس میں اس حد تک مبالغہ آرائی سے کام لیا کہ لوگوں میں عام طور پر غلط فہمی پھیل گئی کہ اسلام کا نظریہ حکومت موجودہ دور کی مروجہ جمہوریت کے سراسر مطابق ہے حالانکہ یہ دعویٰ سفید جھوٹ اور ذہنی غلامی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر جمہوریت سے مراد انسانی حقوق کا تحفظ، رعایا کی نگہداشت اور سب

کے ساتھ یکساں انصاف ہے تو بلا شبہ اسلام دنیا میں اس کا علمبردار ہے اور رعایا کے حقوق کی پاسداری کو فریضۂ دینی قرار دیتا ہے۔ لیکن جمہوریت کی مروجہ قدروں کو جن میں اکثریت کو فیصلہ کن حیثیت دی گئی ہے۔ اسلام ہرگز تسلیم نہیں کرتا۔

لا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ والطیب ولو اعجبک کثرة الْخَبِیْث

(سورۂ مائدہ پ ۷)

پاک اور ناپاک کبھی برابر نہیں ہو سکتے خواہ ناپاک لوگوں کی کثرت کتنی ہی حیران کن حد تک کیوں نہ بڑھ جائے۔

قرانِ مقدس صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ کہتا ہے۔ انسانوں کی اکثریت ہمیشہ گمراہی کا شکار رہی ہے۔

و قلیلٌ من عبادی الشکور

''میرے بہت ہی کم بندے ہیں جو شکر گزار ہیں''

ولکن اکثر الناس لا یعقلون

''لوگوں کی اکثریت عقل سے بے بہرا ہوتی ہے''

ایک اور جگہ فرمایا ہے۔

کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللّٰہ وَاللّٰہ مَعَ الصابرینَ

(سورۂ بقرہ پ ۲)

''بہت سی کم تعداد والی جماعتیں اکثریت والی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آجاتی ہیں۔''

اللہ ہمیشہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے اسلام اقلیت اور اکثریت کی بحث میں

نہیں پڑتا۔ اس کے یہاں فیصلہ کا معیار حق ہے۔ وہ جمہوریت کی اس نوع کا جس میں بقول اقبال:

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں کرتے

ہرگز روادار نہیں۔ اسلام ہر شخص کو اور ہر جماعت کو حق وانصاف کی ترازو میں تولتا ہے۔ اسلام کا نظام حکومت جمہوریت حق کی اساس پر قائم ہے اور حق وہ ہے جو خدا اور رسول کی رضا کے عین مطابق ہو۔ باطل خواہ اپنے ساتھ کیسی ہی عددی اکثریت کیوں نہ رکھتا ہو بہر حال باطل رہیگا اور حق بہر طور حق ہے خواہ اسکے علمبردار معدودے چند ہی کیوں نہ ہوں اور یہ جو کہا جا رہا ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت پر امت کا اجماع مہیا تھا اور اجماع کا انکار کفر ہے تو یہ بھی ایک مذہبی اور تاریخی فریب کے سوا کچھ نہیں تمام کتب تاریخ اس امر کی شاہد ہیں کہ انصار کی اکثریت مجموعی ابوبکر کے حق میں نہیں تھے۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ ابوبکر کو اپنا خلیفہ تسلیم کرلیں اسے اقرار واجماع نہیں کہا جاسکتا اور یہ کہ امت کا اجماع اگر کسی ایسی بات پر ہوجائے جو احکام قرآنی کے سراسر خلاف ہو تو ایسی اجماع کی شرعاً کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ تیسرے یہ کہ اسلام میں اجماع سے مراد مسلمانوں کی اکثریت کا کسی امر پر متفق ہوجانا نہیں ہے بلکہ یہ کہ اجماع کا مفہوم ومنشا یہ ہے کہ اہل الرائے اور اصحاب تقویٰ اور ارباب علم وفضل کسی ایک مسلۂ پر متفق ہوجائیں لیکن یہ بات نہیں تھی البتہ اسے اجماع قریش کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن جہاں قرآن اور سنت کی روشنی موجود ہو وہاں اجماع خواہ پوری امت کا ہو یا کسی قبیلہ کا اس سے قرآن وحدیث کے اصول کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ (نورالانوار، حسامی، توضیح تلویح)

سقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین کے ایک گروہ نے خلافت کے لیئے جو ملی بھگت کی

قرآن مقدس کی ان آیت کے بعد جو ہم نے وراثت انبیاء کے قانون کے بارے میں پیش کی ہیں اسکی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ انصار مدینہ جب اپنے لیئے سعد بن عبادہ کی سرکردگی میں خلافت کا مطالبہ کر رہے تھے تو انھیں حضورؐ کی اس حدیث سے چپ کرایا گیا کہ الائمة من قریش حکمراں قبیلۂ قریش سے ہوں گے۔ جو لوگ اسلام کو جمہوریت کی مروجہ طرز کا علمبردار سمجھتے ہیں انھوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ جمہوریت کی یہ کون سی قسم ہے جسمیں حکومت کو خاندان کے لیئے مختص کر دیا جائے۔ بہر حال انصار نے حدیث سنی تو فوراً ایک سچے مسلمان کی طرح اپنے حق سے دستبردار ہو گئے لیکن اس حدیث کا ردِ عمل ان پر یہ ہوا ایک کہ انھوں نے علی ابن ابی طالب کے لیئے خلافت کا مطالبہ کیا اور انکا ردِ عمل بالکل صحیح اور حق بر صداقت تھا۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد، طبری)

اگر قرابت نبوی استحقاق خلافت کا باعث ہے جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے تو علی ابن ابی طالبؑ سب سے زیادہ اسکے مستحق تھے کہ خلیفہؑ بنائے جاتے اور اگر قرابت نبویؐ وجہ امتیاز نہیں ہے تو جمہوری روایات کا تقاضا تھا کہ خلافت انصار کو ملتی کیونکہ انصار تعداد میں زیادہ تھے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جیسی خدمات انھوں نے سرانجام دی تھیں انکا تقاضا بھی یہی تھا کہ منصب خلافت انکی تحویل میں جاتا لیکن قریش کے چند منھ زور افراد نے نہ حدیث کو ملحوظ رکھا نہ انصار کے استحقاق کو درخور اعتنا سمجھا اور دھاندلی اور دھونس سے ایک ایسا فیصلہ بروئے کار لانے میں کامیاب ہو گئے جو فرامین اللہ اور فرامین نبوت کے سراسر خلاف تھا اور اب اس فیصلہ کو اجماع امت کا نام دیکر مسلمانوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس فیصلہ کو نوشتہ تقدیر اور وحی خداوندی سمجھ کر اسکے آگے سر تسلیم خم کر دیں ورنہ انکا ایمان معرض خطر میں پڑ جائے گا۔

پیغمبرؐ کی تمنا

تاریخ کا اگر غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے اور خلافت کے باب میں حضور نبی اکرمؐ کی رائے کا پتہ چلایا جائے تو یہ جاننے میں کوئی الجھن پیش نہیں آئے گی کہ حضورؐ کی دلی تمنا اور آپ کی خواہش یہی تھی کہ آپ کے بعد علیؑ ابن ابی طالبؑ آپ کے جانشین ہوں۔ بیشمار روایات اور احادیث اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں کہ حضورؐ کو اپنے اہل بیت میں سب سے زیادہ تعلق خاطر حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے تھا۔ حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب کے باب میں احادیث صحیح اس کثرت سے منقول ہیں کہ اہل سنت کے ایک مقتدر امام اور اہل حدیث کے سب سے بڑے حامل احمد بن حنبل کو اعتراف کرنا پڑا کہ:

"ماورد لاحد من اصحاب رسول الله صلى الله عليه و سلم من الفضائل ماورد لعلیؑ" (مستدرک حاکم)

مناقب و فضائل کے باب میں جتنا مواد علیؑ ابن ابی طالب کے حق میں ملتا ہے کسی دوسرے صحابی کے لیئے نہیں ملتا۔

مشہور محدث امام نسائی فرماتے ہیں۔

لم یروفی حق من الصحابة بالا سانيد الجياد اکثر مما جاء فی حق علی کرم اللّٰہ وجهه

"احادیث میں کسی صحابی کے بارے میں اس قدر مستند مواد نہیں ملتا۔ جتنا علیؑ ابن ابی طالب کے فضائل کے باب میں موجود ہے۔"

اس ضمن میں ایک حدیث ایسی بھی ہے جسے خبر متواتر کا درجہ حاصل ہے اور کم وبیش

دس صحابہ نے اس مضمون کو اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، مسند احمد، طبرانی، حاکم، بغوی، ضیا، ابن ابی عاصم اور ابن ابی شیبہ نے مختلف اسناد کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

علیؑ منّی و انا من علی علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں

مسلم نے عائشہ بنت ابی بکرؓ سے روایت کیا ہے اور اسکی تائید مختلف طریق سے دیگر محدّثین نے کی ہے کہ:

خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم و علیہ مرط مرحل من شعر اسود فجاء الحسن بن علی فادخلہ ثمّ جاء الحسین فدخل معہ ثمّ جاءت فاطمۃ فا دخلھا ثم جاء علیؑ فا دخلہ ثمّ قال 'انّما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیراً''

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کے وقت باہر تشریف لائے آپ نے سیاہ بالوں کا دھاریدار کمبل اوڑھا ہوا تھا اتنے میں حسنؑ ابن علیؑ آئے پھر حسینؑ آئے پھر فاطمہؑ تشریف لائیں۔ پھر علیؑ ابن ابی طالب حاضر ہوئے آپ نے ان سب کو کمبل کے اندر کر لیا اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

انما یرید اللّٰہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیراً (سورۂ احزاب ۲۲، ۱، آیت ۳۱)

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اے اہل بیت نبوت! وہ تمھیں ہر قسم کی آلائشوں سے پاک رکھے اور تمھیں پاکیزہ و پاکباز رکھے۔

ابو بکرؓ راوی ہیں وہ فرماتے ہیں حضورؐ ایک خیمہ میں فروکش تھے۔ آپ کے ہاتھ میں

کمان تھی خیمے میں اس وقت علیؑ ابن ابی طالب، فاطمہ زہراؑ اور انکے دونوں بچے حسنؑ اور حسینؑ موجود تھے حضورؐ نے ایک ارشاد فرمایا: "جو لوگ اہل خیمہ کے دوست ہیں میں بھی ان کا دوست ہوں اور جو انکے دشمن ہیں میری طرف سے ان کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ نیک بخت اور باعظمت لوگ ان سے پیار کرینگے اور بدبخت و فرومایا لوگ ان سے بغض رکھیں گے"

(عبقریۃ الامام)

ایک مشہور روایت میں ہے کہ سیّدہ عائشہ سے کسی نے پوچھا "حضورؐ کی محبوب شخصیت کون تھی؟ فرمایا فاطمہ کے شوہر علی ابن ابی طالب اور وہ ایک صائم الدہر اور قائم اللیل شخص تھے (ترمذی کتاب المناقب فضل فاطمہ)

یہ روایت بتا رہی ہے کہ علیؑ ابن ابی طالب حضورؐ کی محبوب شخصیت تھے بلکہ محبوب ترین فرد آپ ہی تھے اور ایک معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ ایک ایسے شخص کے بارے میں حضور کے جذبات و احساسات کا کیا عالم ہوگا جو حضورؐ کا ابن عم، آپ کا پروردہ اور بچپن ہی سے آپ کا خدمت گزار اور وفادار تھا جس کی حیثیت آپ کی نگاہ میں حقیقی اولاد سے کسی طور بھی کم نہ تھی۔ جو آپ کی چہیتی اور اکلوتی بیٹی کا شوہر تھا، جو شب ہجرت آپ کے بستر پر اس اندیشہ کے باوجود سویا کہ مشرکین مکہ اسے محمدؐ کے بدلے موت کی گھاٹ اتار سکتے تھے، جو ہر معرکۂ جنگ میں آپ کا پرجوش اور نڈر سپاہی ثابت ہوا تھا۔ جو آپ کا ہونہار شاگرد اور علوم نبوت کا سچا طالب تھا۔ اور جس کے باپ حضرت ابو طالبؑ نے آپ کی نہ صرف پرورش فرمائی تھی بلکہ آپ کو جان سے بڑھ کر عزیز رکھا تھا۔

ان صفات کی حامل شخصیت کے ساتھ حضورؐ کی خصوصی محبت ایک حقیقت ثابتہ ہے مگر اس کے لیئے نہ عقل و قیاس کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت ہے نہ آسمان و زمین کے

قلا بے ملانے کی حاجت، ان احادیث سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضورؐ کی یہ آرزو تھی کہ لوگ حضرت علیؑ سے محبت کریں چنانچہ جب کبھی کسی گوشے سے حضرت علیؑ کے خلاف آواز اٹھتی تھی تو حضورؐ کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔

ایک مرتبہ حضورؐ نے ایک فوجی دستہ علیؑ کی سپردگی میں مال خمس کی وصولی کے لیے غالباً یمن بھیجا۔ جب یہ فوجی دستہ واپس لوٹا تو دستور کے مطابق بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ ان میں سے چار آدمیوں نے حضورؐ کی خدمت میں حضرت علیؑ کی شکایت کی۔ حضورؐ نے بڑی بے رخی سے ان کی بات سنی۔ حضورؐ کے چہرۂ انور پر غصے کے آثار ہویدا ہو گئے اور تین مرتبہ فرمایا: علیؑ ابن ابی طالب کے بارے میں آپ کے کیا ارادے ہیں؟ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے ان سے فرمایا:

علیؑ سے بغض مت رکھو وہ تو محبت کرنے کے قابل انسان ہیں۔

ایک اور موقع پر کچھ لوگوں نے حضرت علی ابن ابی طالب کے بارے میں حضورؐ سے کوئی شکوہ کیا تو حضورؐ نے انکی شکایت کو بے بنیاد قرار دیا اور فرمایا:

جانتے نہیں ہو علیؑ ابن ابی طالب تن تنہا اللہ کا لشکر ہے "انہ الجیش فی ذات اللہ"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے اظہار محبت کے ساتھ ساتھ بعض ایسے اقدامات بھی فرمائے جن سے یہ واضح ہوتا تھا کہ حضورؐ اپنے بعد علیؑ ابن ابی طالب کی خلافت کے لیے راستہ ہموار فرما رہے ہیں اور بعض موقعہ پر آپ نے کھل کر اس خواہش کا برملا اظہار بھی فرمایا۔ حضورؐ نے جہاں کہیں ذاتی نمائندگی کی ضرورت محسوس کی وہاں علیؑ ابن ابی طالب کے سپرد یہ ذمہ داری کی۔ ہجرت کی رات ہو یا معرکہ تبوک، خیبر کا معرکہ ہو

آیت برائت کے اعلان کا مرحلہ، ہر موقع پر حضورؐ کی نمائندگی اور جانشینی کا شرف حضرت علیؑ کا حاصل ہوا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ سے مدینہ کو واپس لوٹتے ہوئے اپنی وفات سے دو ڈھائی ماہ قبل حضورؐ نے خم غدیر کے مقام پر تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہؓ کے عظیم الشان اجتماع میں حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے بارے میں ایک اہم خطبہ دیا اور اس میں صراحۃً اپنی خلافت کا وارث علیؑ ابن ابی طالب کو قرار دیا۔ حضورؐ نے فرمایا:

من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ اللھمّ وال من والاہ وعاد من عاداہ

"میں جس کا مولا ہوں پس یہ علیؑ بھی اس کے مولا ہیں خدایا! تو اسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور تو اس سے دشمنی رکھ جو علیؑ سے دشمنی رکھے"

اور اس طرح مولائے کائنات علی ابن ابیطالب کے ساتھ عہد موالات استوار کرنا ہر اس شخص کے لئے مذہبی فریضہ قرار پایا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سچے دل سے ایمان لایا ہو گویا حضورؐ نے حضرت علی ابن ابیطالب کی ولایت اپنی ولایت کے لئے شرط قرار دیا اور یوں خلافت علیؑ پر مہر تصدیق ثبت کر دی اگر اس صاف اور صریح ارشاد گرامی کا وہ مفہوم نہیں ہے جو ظاہر حدیث سے واضح ہوتا ہے تو کوئی صاحب ہمیں یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی اور خطاب عام کا کیا مقصد تھا اور کیوں حضورؐ نے اتنے بڑے اجتماع میں بڑے اہتمام کے ساتھ وہ الفاظ کہے اور کیا کسی اور صحابی کے لئے حضورؐ نے کسی موقع پر اس کی ضرورت محسوس فرمائی آخر علی ابن ابی طالبؑ ہی کے لئے یہ خصوصیت کیوں روا رکھی گئی:-

ایک شریف انسان

ایک راستباز سیاست داں

خلافت سے حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی محرومی کے جواز کے بارے میں کچھ لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب خود حضرت علیؑ نے اس صورت حال کے خلاف لب کشائی نہیں کی اور ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ میں اپنے حق کی بازیابی کے لیئے کوئی آواز نہیں اٹھائی اور تغیر احوال کے لیئے کوئی عملی اقدام نہیں فرمایا تو اب ہمیں گڑے مردے اکھاڑنے کی کیا ضرورت ہے اور ہم کیوں نہ امت کے اس فیصلہ کو درست اور برحق تسلیم کریں۔ جس کو خود صاحب معاملہ نے جوں کا توں قبول کر لیا تھا۔

بظاہر یہ بات بڑی وزنی اور معقول نظر آتی ہے لیکن یہاں معاملہ کی اس نوعیت سے مطلقا بحث نہیں ہے اور سوال یہ نہیں کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت درست تھی یا نادرست بلکہ اصل مسئلہ اصول کا ہے کہ اصولی طور پر خلافت پر سب سے پہلا حق کس کا تھا؟ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ پچھلے چودہ سو برس سے اس عقیدہ و اصول کا علمبردار رہا ہے کہ خلافت کے اولیں حقدار علیؑ ابن ابی طالب تھے اور یہ عقیدہ قران و سنت کی رو سے مبنی برحق ہے لیکن جب اس حق سے حضرت علیؑ ابن ابی طالب کو محروم کر دیا گیا تو ملکی اور مذہبی مصالح کا تقاضا تھا کہ اس وقت کوئی ایسی ہنگامہ آرائی نہ کی جائے جس سے ملک میں داخلی انتشار کو ہوا ملے اور دشمنان دین کے ناپاک عزائم کی تکمیل کی راہ ہموار ہو، مانعین زکوۃ کا فتنہ، قبائل میں ارتداد کی آبا، جھوٹے مدعیان نبوت کی شرانگیزی اس پر مستزاد ایران و روم کے حکمرانوں کی دسیسہ کاری یہ سب خطرات ایسے نہیں تھے کہ کوئی مخلص مسلمان ان سے قطع نظر کر کے اپنے شخصی اور انفرادی

حق کی بازیابی کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ اس لیئے حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے اسلام کے سچے بہی خواہ اسلامی ریاست کے مخلص کارکن اور ایک شریف انسان اور راست باز سیاست داں کی طرح اس سارے قضیۂ نامرضیہ سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور خاموشی کو ترجیح دی اور اس طرح انھوں نے اسلام دوستی اور بے نفسی کا اعلیٰ مظاہرہ فرمایا اور ایسی کوئی بات نہیں ہونے دی جس سے اسلام کے کاز اور آورش کو ضعف پہنچے اور مسلمانوں میں سر پھٹول یا خانہ جنگی کی کیفیت نمودار ہو اور رہتی دنیا تک مسلمانوں کی جگ ہنسائی کا سامان ہوتا رہے۔

اور جب اسلام کے ایک دشمن نے جو بہ ظاہر مسلمان ہو چکا تھا ابوبکر کے خلیفہ بنے پر حضرت علیؑ سے آ کر کہا کہ۔

فما بال هذا الامر فی اقل من قریش والله لئن شئت لا ملان علیه خیلاً و رجالاً۔

یہ کیا غضب ہوا کہ قریش کے سب سے چھوٹے قبیلہ میں خلافت چلی گئی۔ بخدا اگر تم چاہو تو میں سواروں اور پیادوں کی فوج لیکر اس پر چڑھ دوڑوں۔

اس پر حضرت علیؑ نے یہ کہہ کر اس کا منھ بند کر دیا:

یا اباسفیان! طالما عادیت الاسلام و اهله فلم تضره بذلك شیئاً انا وجدنا ابابکر لها اهلاً۔

اے ابوسفیان! تم نے ہمیشہ اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا مگر اس طویل عرصہ کی اسلام دشمنی کے باوجود تم اسلام کا کچھ بھی تو بگاڑ نہیں سکے۔ مسند خلافت کے لیئے ابوبکرؓ ہمارے نزدیک موزوں ہیں۔

ان کے اس ارشاد سے ان کے وسعتِ قلب ان کی عالی ظرفی انکی اسلام دوستی ا[ور] کی مروّت وشرافت اور انکی عظمت کردار نمایاں ہوتی ہے کہ وہ ایساپر آشوب دور تھا کہ اس میں [شا]ید طالع آزما۔ حضرت علیؓ ابن ابی طالب کا یہ ارشاد اس امر کا غماز ہے کہ وہ ایسا پر آشوب دور تھا کہ اس میں ابوبکرؓ کی حکومت کے خلاف کوئی اقدام اسلام کے لیئے تباہ کن ثابت ہوسکتا تھا البتہ ایک ابوسفیان تھا جسے حالات کی نزاکت کا ہرگز احساس نہیں تھا بلکہ وہ اس فکر میں تھا کہ کوئی موقعہ ہاتھ لگے تو مسلمانوں کو زک پہنچانے اور اسلام کو کمزور کرنے کی سازش عمل میں لائی جائے اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ہم ان اوراق میں ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ خاندان بنی امیہ کے لیئے اسلام ایک کڑوا گھونٹ تھا جسے چاروناچار اسے حلق سے نیچے اتارنا پڑا ورنہ کہاں اسلام اور کہاں ابوسفیان اور اسکا خاندان جنداں مفترقان ای الفرق، بجائے اس کے صرف اسی ایک واقعہ سے حضرت علیؓ کی عظمت وشان کا اندازہ کیا جائے انکی خاموشی کو انکی بزدلی محمول کیا جاتا ہے اور ان کے حریفوں کے معمولی معمولی واقعات کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ہمارے ان کرم فرماؤں کا دستور بن گیا ہے۔

سچ پوچھئے تو پوری اسلامی تاریخ میں ایثار اور اپنے جائز حق سے دست برداری کی ایسی شریفانہ مثال دستیاب نہیں ہوسکتی۔ ایک شخص یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسکی حق تلفی ہورہی ہے محض اسلام کے وسیع تر مفاد کی خاطر اپنے حق سے دست بردار ہو جاتا ہے اور پھر ان لوگوں کے خلاف جو اس حق کے غاصب تھے نہ انھوں نے کسی سازش میں حصہ لیا نہ انکے خلاف دل میں بغض وحسد کے جذبات رکھے، نہ انھیں اپنے خیر خواہانہ مشوروں سے محروم کیا نہ کوئی ایسا اقدام فرمایا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اپنے پچھلوں سے عناد وکد ہے علیؓ ابن ابی طالب جیسا بہادر اور شریف النفس انسان فرمائے گی کہ ہر عمل سے کوسوں دور رہا لیکن امام

عالی مقام کی اس عظمت کو وہ لوگ کیونکر سمجھ سکتے ہیں جن کی نگاہ میں معاویہ بن ابی سفیان ایک پسندیدہ شخصیت ہو کہ جس کی زندگی کا کل اثاثہ ہی سازش، جعل، فریب، سیاسی جوڑتوڑ، دھونس، دھاندلی، خودغرضی اور مصلحت کیشی رہا ہو شرافت کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیئے ضروری ہے کہ انسان خود بھی شرافت سے تہی دامن نہ ہو اور انسانی عظمت کو پرکھنے کے لیئے نگاہ ودل کا پاکیزہ ہونا شرط ہے اور بقول اقبال:

نگاہ پاک وخیالی بلند وذوق لطیف
کہ جسم وروح میں پاکیزگی تو ہے نایاب

پھر بھلا وہ لوگ جو خبیث وطیب کو ایک ترازو میں تولتے ہوں ان سے یہ توقع کیونکر کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی کی شرافت کی داد دیں گے:

تھا جو ناخوب وہی خوب ہوا نظروں میں
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

میٹھا میٹھا ہڑپ کڑوا کڑوا تھو

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر اس امر واقعہ کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ آج کل جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وراثت کے منکر ہیں اور اسے سنت انبیاء کے خلاف سمجھتے ہیں خود ان کے یہاں ہدایت وارشاد کے تمام مناصب کا سلسلہ صدیوں سے قائم چلا آرہا ہے مدارس عربیہ ودینیہ میں یہ طریقہ آج بھی رائج ہے، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم وبانی قاسم نانوتوی تھے۔ ان کے بعد انکے بیٹے ابوالبرکات محمد احمد صاحب آج کل بانی مدرسہ کے بیٹے قاری محمد طیب اس کے کرتا دھرتا ہیں۔ حزب الاحناف لاہور کے بانی مولوی دلدار علی تھے۔ ان کے

بعد انکے بیٹے ابوالبرکات محمد احمد صاحب اس ادارے کے بلا شرکت غیرے مالک ہیں، خیر المدارس ملتان کے مہتمم مولوی شیر محمد صاحب بقید حیات ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے لڑکے مولوی شریف کو نائب مہتمم بنا دیا۔ مشہور تبلیغی جماعت کی بنیاد مولوی الیاس کاندھلوی نے رکھی۔ انکے مرنے کے بعد انکا لڑکا یوسف ان کا جانشین بنایا گیا حالانکہ تبلیغی جماعت میں ان سے قابل تر لوگ موجود تھے۔ بیعت وارشاد کے سجادہائے خانقاہی کے مسند نشینوں کے یہاں تو اس رسم کا چلن بہت پرانا ہے شیخ عبدالقادر جیلانی کے جانشین اُن کے فرزند سیف الدین عبدالوہاب بہاءالحق ذکریا ملتانی کے جانشین اُن کے لڑکے صدرالدین عارف بنے پھر شاہ رکن عالم اس گدی پر بیٹھے وہ صدرالدین عارف کے فرزند تھے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے جانشین اُن کے لڑکے محمد معصوم ہوئے لاہور کے ایک عالم اور پیر مولوی احمد علی صاحب کے صاحب کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا انھوں نے مرتے وقت باقاعدہ وصیت کی کہ اُن کے دونوں بیٹوں کو کسی قدر فرق مراتب کے ساتھ اُن کی مسند کا متولی بنادیا جائے حتیٰ کہ مساجد تک دونوں بھائیوں میں بانٹ دی گئیں انھوں نے باقاعدہ اخبارات کے ذریعے اس کا اعلان کیا۔ اُن کے لڑکے عبیداللہ انور صاحب جو واجبی سے علم کے آدمی ہیں آج کل جانشین شیخ التفسیر کہلاتے ہیں۔ اگر انبیاء کی سنت اس کے برخلاف ہے اور اسی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو اپنا وارث نامزد نہیں فرمایا تو یہ حضرات جو خود کو مسند نبوت کا وارث کہتے ہیں اس موقع پر حضور کی سنت سے منحرف ہوئے۔

جہاں اپنے خاندان کی روزی اور اس کے معاش کا سوال ہو وہاں تو سنت نبوی ایک لفظ بے معنی بن جاتی ہے اور آگے پیچھے حلوے کا شوق بھی اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس کا کھانا سنت ہے، اسے کہتے ہیں "میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو" اب جا کر یہ عقدہ وا ہوا کہ امیر

معاویہ کے بارے میں یہ لوگ اتنے حساس کیوں ہیں جس کی جاری کردہ سنت کے طفیل آج تک اُن کی مسندوں اور سجادوں کا بھرم قائم ہے اگر یہ اُس کی تعریف نہیں کریں گے تو کس کی کریں گے ورنہ کل کلاں اگر کوئی پلٹ کر ان ملا دو پیازوں سے پوچھ لے کہ آپ اپنے باپ دادا کی گدی پر کس منھ سے براجمان ہیں تو معاویہ اور یزید کے دامن کے سوا اور کونسی منھ چھپانے کی جگہ اُن کو مل سکے گی۔

وزیر باتدبیر

کہا جاتا ہے کہ حضرت علی مرد میدان تو ضرور تھے مگر سیاسی عقل و تدبر سے اُنھیں کچھ زیادہ حصہ نہیں ملا تھا اس لئے حضور نے اُن کے بجائے ابوبکر و عمر کو اپنا وزیر بنایا اور چونکہ حضرت علیؑ ایک دور اندیش سیاست داں اور قابل مدبر نہیں تھے بناء برایں حضورؐ کے بعد خلافت اُنکے بجائے ابوبکر و عمر کے حصہ میں آئی لیکن روایت و درایت کے اعتبار سے یہ سارا مفروضہ ہی بے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔

بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ روایت سعد ابن ابی وقاص سے مروی ہے کہ (بخاری کتاب المناقب۔ مناقب علی۔)

انّ رسول اللہ صلیٰ اللہ علیه وآله وسلم خلف علیاً رضی اللہ فی غزوت تبوك فقال یا رسول اللہ اتخلفنی فی النساء و الصبیان فقال اما ترضیٰ انتکون منّی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انّه لا نبی بعدی۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معرکۂ تبوک کے موقع پر حضرت علیؑ کو اپنا

نائب مقرر کیا اس پر حضرت علی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جارہے ہیں؟ فرمایا کہ کیا تمھیں پسند نہیں ہے کہ تم میرے لئے وہی کچھ ہو جو موسیٰ کے لئے ہارون تھے فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے ہارون اپنے بھائی موسیٰ کے وزیر مقرر کئے گئے تھے۔

ولقد اتینا موسیٰ الکتاب وجعلنا معهم اخاہ ھارون وزیراً.

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی اور اس کے بھائی ہارون کو اس کا وزیر مقرر فرمایا۔ اس قدر واضح نص قطعی کی موجودگی میں حضرت علی ابن ابیطالب کو وزارت کا نااہل قرار دیکر اس منصب پر کسی دوسرے صحابی کو لاکر بٹھا دینا اور سیاسی تدبیروں سے حضرت علی پر فوقیت دینا صریحاً بد دیانتی ہے اور اسے بجز بغض علی کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

سلطنت بنو عباس کے ایک مشہور خلیفہ معتصم باللہ کے عہد حکومت میں اس دور کے ایک زبردست عالم شہاب الدین احمد بن ابی ربیع نے امور سلطنت کے نظم وضبط کے بارے میں ایک کتاب "سلوک المسالک فی تدبیر الممالک" تالیف کی تھی اس میں وزارت کے موضوع پر آپ نے معتصم باللہ کو خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے:-

اعلم انّہ لا بد لمن نقلا الخلافة والملکمن من وزیر علیٰ نظم الامور معین علیٰ حوادث الدھور یکشف له صواب الله بین التدبیر الاتریٰ ان نبینا صلیٰ الله علیه وسلم مع ما خصّه الله تعالیٰ به من الاکرام اتاہ من الایات العظام وعدہ باظھار الدین وایدہ بالملائکة المقربین وھو مع ذالك موفق الصواب موید بالرشاد اتخذ علی ابن ابیطالب کرم الله وجهه وزیراً فقال انت بمنزلة ھارون من موسیٰ قال

الله تعالیٰ ولقد اتینا موسیٰ الکتاب وجعلنا معه اخاہ ھارون وزیراً فلوا ستغنی احداً ممن ذکرنا عن الموائدة والمعاضدة برایه وتدبیره لاستغنی نبینامحمدوموسیٰ صلوات الله علیهما سلام۔

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہر ایک والی ملک وخلافت کے لئے وزیر کا ہونا لابدی ہے تاکہ ملکی نظم ونسق اور حوادث پیش آئندہ میں اس کا مددگار ثابت ہو اور حسن تدبیر سے سیاسی معاملات سے حاکم وقت کو آگاہ کرتا رہے دیکھیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عظمت وجلالت شان کے باوصف اور باوجود یکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں آیات بینہ سے نوازا اور غلبۂ اسلام کے وعدہ سے اور ملائکہ مقربین کی تائید خصوصی سے سرفراز فرمایا تھا۔ وہ خود بھی وحی والہام کی قوتوں سے بہرہ ور تھے، توفیق الٰہی کی دستگیری اور رشد وہدایت کی تائید غیبی بھی اُن کے شریک حال تھی تاہم حضور نے علی ابن ابیطالبؑ کو اپنا وزیر مقرر کیا اور فرمایا "تم میرے وزیر ہو جیسے ہارون موسیٰ کے وزیر تھے اور قرآن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے" کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب مرحمت فرمائی اور اُنکے بھائی ہارون کو اُن کا وزیر مقرر فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی رائے اور تدبیر کی بناپر وزیر ومشیر سے مستغنی ہوتا تو حضرت محمدؐ اور حضرت موسیٰؑ سب سے زیادہ اس کے اہل تھے حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی سیاسی بے تدبیری کے ثبوت میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ انھوں نے خلیفہ بنتے ہی معاویہ کو شام کی گورنری سے معزول کر دیا حالانکہ مغیرہ بن شعبہ، عبداللہ ابن عباس اور زیاد بن حنظلہ تمیمی نے آپ کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ آپ نے ان لوگوں کے مشورے کو مسترد کر دیا اور فرمایا: "نہیں اللہ کی قسم میں معاویہ کو دو دن کے لیئے بھی گورنری کے منصب پر نہیں رہنے دونگا" عثمانؓ بن عفان کے زمانۂ حکومت میں حضرت علیؑ نے بارہا حضرت عثمانؓ کو یہ مشورہ دیا کہ معاویہ کو ان کی بد

عنوانیوں کی بنا پر اس منصب سے ہٹا دیا جائے۔ مگر انھوں نے ایسا کرنے سے معذوری ظاہر کی ایسے حالات میں جب خلافت کی مسند پر حضرت علیؓ ابن ابی طالب جلوہ فرما ہوئے تو وہ کیونکر گوارا کر سکتے تھے کہ ایک غلط اور بدعنوان شخص ان کی قلمرو خلافت میں ایک صوبہ کا گورنر بنا رہے اور صرف وقتی مصلحت کی بناء پر اس پر کچھ تعرض نہ کیا جائے اور اس کی بدعنوانیوں کو برداشت کیا جاتا رہے علیؓ ابن ابی طالب جیسے کردار اور مزاج کے انسان سے بدی سے مفاہمت اور مصلحت کیشی کی توقع کیونکر کی جاسکتی ہے ان کی بدترین ناقد بھی ان پر یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ وہ صداقت سے عاری اور جھوٹے شخص تھے یا تصنع اور فریب کا ان میں شائبہ تک موجود تھا۔ حالانکہ اگر وہ اپنے حریفوں کا سا وطیرہ اختیار کرتے تو اپنے دور کے کامیاب ترین حکمراں ثابت ہوتے۔ خصوصاً بدنیت لوگوں کے معاملہ میں منافقانہ طرز عمل انھیں کامرانیوں سے ہمکنار کر سکتا تھا لیکن انھوں نے جھوٹ کا ہتھیار نہ دوستوں پر آزمایا نہ دشمنوں پر اور کسی حالت میں بھی سچائی سے دستکش ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ خود ان کے زمانہ میں ان کے اس طرز عمل کی بناء پر لوگوں نے انکے بارے میں یہ کہا کہ وہ سیاست کی الجھ سے بھی ناواقف ہیں اور انھیں سیاسی جوڑ توڑ کرنا نہیں آتا لیکن وہ ان تمام نکتہ چینیوں کے باوجود اپنے موقف پر سختی سے قائم رہے اور بال برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ ان کا موقف ایک سچے مسلمان کا سا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے:۔

"ایمان کی علامت یہ ہے کہ سچائی کو اس موقع پر اختیار کیا جائے جہاں اس سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو اور جھوٹ سے ایسے مرحلہ پر گریز کیا جائے جہاں اس کے ذریعہ فائدہ پہنچنے کا امکان ہو۔

اگر یہ چیز غلط کارانہ سیاست کے نقطۂ نگاہ سے سیاسی بے تدبیری اور عدم تدبر کے

مترادف ہے تو ہمیں تسلیم ہے کہ امام علیؑ ابن ابی طالب ان معنوں میں واقعتاً ایک کامیاب سیاست داں نہیں تھے۔

مسئلۂ قصاص

قاتلان عثمانؓ سے قصاص لینے میں تساہل برتنے کا جو الزام حضرت علیؓ ابن ابی طالب پر عائد کیا جاتا ہے وہ بھی ایک سیاسی بہتان ہے ہم نے بعض غیر ذمہ دار اور نام نہاد اہل علم سے یہ سنا ہے کہ وہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو "مانعین قصاص کے زمرے میں شامل کر کے ان کو "مانعین زکوٰۃ" کی مانند مجرم قرار دیتے ہیں اور اس طرح امیر معاویہ کے خروج کو سند جواز بخشتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابوبکرؓ میں مانعین زکوٰۃ کے خلاف فوجی اقدامات کیئے اور وہ از روئے شرع حق بجانب تھے اور قرآن میں جہاں زکوٰۃ کے وجوب کا حکم ملتا ہے وہاں قصاص کا وجوب بھی قرآن ہی سے ثابت ہے اس لیئے قصاص کے منکر کے خلاف بھی جہاد ضروری ہے بنا بریں حضرت عائشہؓ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور امیر معاویہ حق پر تھے اور انھوں نے حضرت علیؓ کے خلاف خروج کر کے ایک صحیح قدم اٹھایا" یہ ہے ان لوگوں کی رائے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے بارے میں "مانعین زکوٰۃ" کا ارتداد تو ثابت ہے اور اب یہ لوگ حضرت علیؓ کو منکر قصاص ثابت کر کے ان کے اسلام ہی کو محل نظر اور مشکوک بنانے کے درپے ہیں۔

"قد بدت البغضاء من افواههم وما تخفی صدورهم اکبر"

ان کی زبانیں کھلم کھلا اپنے بغض کا اظہار کرنے لگی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ شدید ہے۔

عثمانؓ بن عفان کا قتل ایک فرد یا چند افراد کی سازش کا نتیجہ نہیں تھا کہ اس کے لیئے واویلا کیا جاتا۔ ایک حقیر اقلیت کو چھوڑ کر پوری امت کی اجتماعی بغاوت کے سبب یہ حادثہ رونما ہوا۔ ایسی صورت میں قصاص کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے۔ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لینے کے مسئلہ میں حضرت علیؓ ابن ابی طالب کا موقف اپنی جگہ پر بالکل درست تھا اور آپ اس معاملہ میں بالکل بے قصور تھے۔ جن لوگوں نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی بیعت سے انحراف کیا تھا وہی آپ سے قصاص کا مطالبہ کرنے میں پیش پیش تھے۔ حالانکہ بیعت کے بعد اگر وہ آپ سے اس کا مطالبہ کرتے تو ایک بات بھی تھی اور انکے رویّہ کو کسی حد تک صحیح قرار دیا جا سکتا تھا۔ پھر ایسے حالات میں جب کہ ہر شخص قتل عثمان کیذمہ داری قبول کرنے کو تیار تھا۔ حضرت علیؓ آخر کس کس کو اس الزام میں پکڑتے۔ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ آپ نے قاتلین کو سزا دینے کا اعلان فرمایا۔ یہ سنتے ہی دس ہزار سے زیادہ افراد نے "ہم سب قاتلین عثمانؓ ہیں" کے نعرے لگائے پھر یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی زندگی میں جو لوگ انکے سخت ترین مخالف تھے وہ محض ایک سیاسی اسٹنٹ کے طور پر اس مطالبہ کو ہوا دے رہے تھے۔ اور اس ہتھیار سے حضرت علیؓ کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت عائشہؓ حضرت عثمان کو سخت ناپسند کرتیں تھیں اور رائے عامہ کو انکے خلاف کرنے میں حضرت عائشہ کا بڑا ہاتھ تھا لیکن اب وہ بھی خونِ عثمان کے قصاص کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ حضرت علیؓ کے خلیفہ بننے کی خبر ملی تو وہ مکہ سے مدینہ واپس آ رہیں تھیں یہ خبر سن کر انھوں نے اپنی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا "اگر آسمان ٹوٹ پڑتا تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا اس خبر سے ہوا عثمانؓ مظلوم شہید ہوئے۔ میں ان کا بدلہ ضرور لوں گی"۔ ایک شخص نے کہا "ام المومنین آپ خونِ عثمانؓ کا انتقام لینے کی بات کر رہی ہیں۔ حالانکہ یہ آگ آپ ہی کی بھڑکائی ہوئی ہے"

فرمایا "اب میری رائے بدل گئی ہے میں کل تک جو کہتی رہی ہوں اس سے میرا آج کا موقف زیادہ وزنی اور معقول ہے" یہ حال تو عائشہ صدیقہ کا تھا۔ غالباً حضرت عائشہ واقعہ افک کی اس تلخ یاد کو فراموش نہیں کر سکیں تھیں کہ جب ان پر ایک منافق نے تہمت لگائی اور بات پھیل گئی اور حضورؐ ان کے معاملہ میں تذبذب کا شکار ہو گئے کہ انھیں اپنے عقد میں رکھیں یا ان سے قطع تعلق فرمائیں تو علیؓ ابن ابیطالب نے حضورؐ کو مشورہ دیا کہ آپ عائشہ کو طلاق دے دیں۔ (ہم امیر المومنین حصہ اول میں ثابت کر چکے ہیں کہ خود پیغمبرؐ نے علیؓ سے ایسا مشورہ لیا نہ کہ علیؓ نے ایسا مشورہ دیا۔ مدیر صلاح)

اس کے علاوہ حضرت علیؓ کی مخالفت کرنے سے حضرت عائشہؓ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ طلحہؓ یا زبیرؓ میں سے کسی کو خلیفہ دیکھنا چاہتیں تھیں۔ ان دونوں شخصیتوں میں حضرت عائشہؓ کی دلچسپی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت طلحہؓ حضرت عائشہؓ کے ہم قبیلہ تھے۔ دونوں کا تعلق قبیلہ بنی تیم سے تھا اور حضرت زبیرؓ بن العوام عائشہؓ کے بہنوئی یعنی انکی بڑی بہن اسماء بنت ابو بکرؓ کے شوہر تھے، قتل عثمانؓ کے بعد جب قرعہ فال ان دونوں میں سے کسی ایک کی بجائے حضرت علیؓ کے نام نکلا تو حضرت عائشہؓ اسے برداشت نہ کر سکیں اور قتل عثمانؓ کے قصاص کی آڑ میں حضرت علیؓ کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ (طبری ج ۵، ص ۱۵۳ تا ۲۲۵، مروج الذہب ج ۲، الفخری لابن طباطبا ص ۸۰، العقد الفرید ج ۲ ص ۲۲۵)

حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ دونوں خلافت کے پر جوش امیدوار تھے اور ان میں ہر ایک کو اپنی جگہ یقین تھا کہ عثمانؓ بن عفان کے بعد خلافت ان کے حصہ میں آئے گی کیونکہ حضرت عائشہؓ کی حمایت انھیں حاصل تھی لیکن جب حالات کی رفتار نے ان کی آرزوؤں کو ناکام کر دیا تو اب یہ لوگ قتل عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کرنے لگے حالانکہ حضرت عثمانؓ کی زندگی میں ان

دونوں بزرگوں کی روش انکے خلاف تھی حضرت طلحہ اور حضرت عثمان کے تعلقات کی کشیدگی کا یہ عالم تھا کہ باوجود اس کے کہ حضرت عثمانؓ نے بار ہا طلحہ کو اس قدر زیادہ زرو مال دیا جو انکی ضروریات سے بہت زیادہ تھا۔ پھر بھی ان کی دشمنی کو دیکھ کر یہ کہا کہ میں نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا لیکن اب وہی طلحہ میری جان کا لاگو ہو رہا ہے خدایا اسکو اسکی دولت سے بے بہرا رکھ اور میرے ساتھ اس نے جو سلوک کیا ہے اسکا بر ابدلہ دے۔ ابھی حضرت طلحہؓ کے بارے میں یہ تک بھی سننے میں آیا کہ جس روز حضرت عثمانؓ شہید ہوئے حضرت طلحہؓ نے باغیوں کو ایک قریبی مکان کا راستہ بتایا تا کہ وہ اس راستہ سے ہو کر حضرت عثمانؓ کے گھر میں داخل ہو سکیں لیکن حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد یہی طلحہؓ یکا یک ان کے خون کا قصاص کے درپے ہو گئے۔ (عبقریۃ الامام العباس محمود العقاد)

عمر بن العاص کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ایک طرف حضرت عثمانؓ کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا رہا لیکن جب حالات نازک صورت اختیار کر گئے تو انھیں چھوڑ کر فلسطین چلا گیا۔ وہ کہا کرتا تھا

"میں نے ایک ایک چرواہے کے دل میں عثمانؓ بن عفان کے خلاف نفرت پیدا کر دی ہے"

لیکن بعد میں یہی عمر بن العاص خونِ عثمانؓ کا قصاص طلب کرنے والوں میں پیش پیش تھا اور امیر معاویہ کا دست راست بن گیا۔

خود معاویہ کا یہ حال تھا کہ انھوں نے بھی خونِ عثمانؓ کی ہی آڑ لے کر حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کی لیکن جب حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے قاتلانِ عثمانؓ سے کوئی فوری تعرض نہیں کیا اور حضرت عثمانؓ کی بیٹی عائشہ نے ان سے اس تساہل

پسندی کا شکوہ بھی کیا۔ اس پر امیر معاویہ نے انھیں ٹال دیا اور حالات کے روبہ اصلاح ہونے کے بعد قاتلانِ عثمانؓ سے نپٹنے کی امید دلائی لیکن حضرت علیؑ سے ان کا مطالبہ فوری کاروائی کرنے کا تھا جب کہ عوامی شورش کا ہیجان ابھی ابھی فرو نہیں ہوا تھا۔

یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ خونِ عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ محض حضرت علیؑ کو زچ کرنے اور انکی حکومت کو ناکام کرنے کی غرض سے تھا اور ہر فریق اپنی جگہ ایک سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ کسی کی نیت بھی نیک نہیں اور کوئی بھی شخص ان ہنگامی حالات میں نہ تو قاتلانِ عثمانؓ کو اپنی گرفت میں لے کر کیفرِ کردار تک پہنچا سکتا تھا نہ شورش پسندوں کا زور توڑ کر سکتا تھا۔

حضرت عثمانؓ نے اپنے حق میں خود کانٹے بوئے تھے اور جب وہ غلط روش کو اپنائے ہوئے تھے تو یہی معاویہ اور یہی عمرو بن العاص اور اسی قماش کے دوسرے لوگ ان کے مددگار بنے ہوئے تھے اور جب وہ اپنی سزا کو پہنچ گئے تو اب یہی غلط کار مشیر ان کی مظلومیت کے ماتم گسار بن گئے۔

مرد میدان

حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی خلافت کی ناکامی کے بہت سے اسباب تھے ایک بڑا سبب انکی شجاعت اور اسلامی غزوات میں ان کی تیغ آزمائی اور انکے بہادرانہ کارنامے بھی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد ہمایوں میں کافروں کے خلاف جس قدر معرکے برپا ہوئے ان میں حضرت علیؑ ابن ابی طالب ایک پر جوش اور جیالے سپاہی کی طرح شریک رہے۔ جنگ تبوک کے سوا باقی ہر غزوہ و معرکہ میں اسلامی افواج کے علمبردار کا منصب جلیل

حضرت علیؑ کو دیا جاتا رہا ہے اور اس دور میں یہ منصب سپہ سالار افواج کے بعد سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا! طبقات ابن سعد اور دیگر معتبر کتب تاریخ میں مزکور ہے کہ:

"ان علی ابن ابی طالب کان صاحب لواء رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم بدر و فی کل مشهد"

جنگِ بدر میں اور ہر معرکہ میں حضرت علیؑ ابن ابی طالب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فوج کے علمبردار ہوتے تھے۔

حضرت علیؑ کی تیغ خارا شگاف نے کتنے ہی کافروں کو موت کے گھاٹ اتارا اور کتنے ہی سورماؤں کا غرور خاک میں ملا کر رکھ دیا۔ مشرکین عرب کا کوئی قابل ذکر قبیلہ ایسا نہ تھا جس کے دو چار نامور بہادر علیؑ ابن ابی طالب کی شمشیر آبدار کا لقمہ نہ بنے ہوں۔ قبائلی نظام میں نسلوں تک اس چیز کا اثر محسوس کیا جاتا ہے اور حضرت کے معاملہ میں بھی چیز اثر انداز ہوئی اور ان قبائل کے اسلام قبول کر لینے کے باوجود ان کے دلوں سے یہ رنجش اور کدورت زائل نہ ہو سکی خصوصا بنی امیہ کا نانا عتبہ بن ربیعہ، معاویہ کا ماموں ولید بن عتبہ اور معاویہ کا بھائی حنظلہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موخرالذکر دونوں جنگ بدر میں آپ کی تلوار کے شکار ہوئے جبکہ عتبہ کو آپ کے چچا حمزہؓ نے تہہ تیغ کیا۔

بنو امیہ کے علاوہ دوسرے کئی ایک قبیلوں کے سردار بھی آپ کے ہاتھوں موت کا شکار ہوئے اور یہ ایسی بات ہے جسے لوگ بھلانا بھی چاہیں تو بھلا نہیں سکتے۔ حضرت علیؑ کو اس امر کا احساس تھا کہ قریش کے لوگ اسی بناء پر ان کی مخالفت کر رہے ہیں چنانچہ ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا بھی کہ:

"وہ قریش کے لوگ مجھے کیوں کر برداشت کر سکتے ہیں۔ میں نے انھیں اس وقت

بھی قتل کیا جب وہ کفر کی حالت میں تھے اور اب جب کہ وہ گمراہی کا شکار ہو چکے ہیں۔ میری تلوار ان کا تعاقب کرتی رہے گی"

سرمایہ داروں کا گٹھ جوڑ

حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی خلافت کی ناکامی کا ایک باعث سرمایہ داروں کا آپس کا گٹھ جوڑ بھی تھا اس گروہ میں بڑے بڑے صحابہ شامل تھے۔ سرمایہ داروں کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے وہ کسی ایسی تبدیلی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے جس سے ان کی دولت و ثروت پر زد پڑتی ہو جو انھیں ان کے مال و زر سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دے اور جس سے انھیں عیش و عشرت کی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ (انساب الاشراف البلاذری ج ۵۔ ص ۲۵)

مشہور مورخ مسعودی کی روایت کے مطابق عثمان کے عہد خلافت میں صحابہ کی امارت و ثروت کا یہ عالم کہ زر و سیم کے ڈھیروں کے ڈھیر انکے پاس موجود تھے اور انھوں نے ایسا ٹھاٹھ جما رکھا تھا کہ شائد بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوا ہو عثمان جب ہلاک ہوئے تو اُن کا ذاتی اثاثہ جو ان کے خزانچی کی تحویل میں تھا اسکی تفصیل یہ تھی۔

ڈیڑھ لاکھ طلائی دینار، دس لاکھ درہم ایک لاکھ دینار کی غیر منقولہ جائداد، جو وادی قری حنین اور دوسرے علاقوں میں تھی اس کے علاوہ گھوڑوں اونٹوں کی کا تو کچھ شمار نہ تھا (یاد رہے کہ ایک طلائی دینار مساوی ہوتا تھا پچاس روپے کے۔ زبیر بن العوام کی چھوڑی ہوئی دولت کا آٹھواں حصہ (۱-۸) پچاس ہزار دینار سے زیادہ تھا ایک ہزار عمدہ نسل کے گھوڑے اور ایک ہزار لونڈیاں اس پر مستزاد تھیں۔

طلحہ کا عراق کی سرزمین سے غلہ کی پیداوار سے ایک ہزار دینار یومیہ کی آمدنی تھی۔ راوی سیراۃ کی زمین سے انکی آمدنی کا تناسب اس سے بھی زیادہ تھا۔

عبدالرحمان بن عوف کے اصطبل میں ایک ہزار گھوڑے، ایک ہزار اونٹ اور دس ہزار بھیڑ بکریاں تھیں اُن کی جائداد کا چوتھا حصہ (۱/۴) چھیالیس ہزار دینار کے لگ بھگ تھا۔

زید بن ثابت نے سونے اور چاندی کے اتنے بڑے بڑے ٹکڑے ورثہ میں چھوڑے تھے کہ انھیں پھاوڑے ہتھوڑوں اور کلہاڑوں سے توڑ توڑ کر اُن کے ورثہ میں تقسیم کیا گیا منقولہ اور غیر منقولہ جائداد اس کے علاوہ تھی۔ زبیر نے مصر کوفہ، بصرہ اور اسکندریہ میں عالی شان محل تعمیر کروائے طلحہ کی ایک کوٹھی کوفہ میں اور ایک مدینہ منورہ میں تھی سعد بن ابی وقاص نے عتیق میں اپنے لئے ایک نہایت شاندار دو منزلہ محل تعمیر کروایا۔ مقداد نے بھی اپنے لئے ایک محل نما مکان بنوایا۔ یعلی بن منبہ پچاس دینار نقد کے علاوہ وسیع و عریض زمین کے مالک تھے جس کی قیمت تین لاکھ درہم تھی درہم سے زیادہ تھی۔ (مروج الذہب المسعودی، طبقات ابن سعد، طبری، ابو حنیفہ دینوری،) (یہاں معاویہ بن ابی سفیان کی عیاشانہ زندگی کا ذکر محض اس لئے نہیں کیا گیا کہ خود اہل سنت کے نزدیک بھی معاویہ عمر کے قول کے مطابق "کسرائے عرب" کی زندگی بسر کرتے تھے حضرت ابوذر غفاری سے اُن اختلاف کا بڑا سبب بھی یہ ہوا کہ وہ دمشق میں اپنے لئے لاکھوں روپے صرف کرکے "الخضر" نام کا ایک عالی شان محل تعمیر کروا رہے تھے اور سارا روپیہ بیت المال سے اُس پر صرف ہو رہا تھا اور یہ واقعہ اُن کی گورنری کے دور کا ہے دور خلافت کی عیاشیوں کا اندازہ اس سے قائم کر لیجیے۔) سرمایہ داروں کا یہ گروہ علی ابن ابیطالب کے مزاج کی افتاد سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ اب اُن کے ٹھاٹھ قائم نہیں رہ سکیں گے جو عثمان بن عفان کے زمانہ میں میسر تھے اور انھیں

اس مال و دولت کا حساب دینا ہوگا جس کے انبار انھوں نے جمع کر لئے تھے حضرت علی ابن ابیطالب کی زندگی کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھی اور وہ جانتا تھا کہ اگر خلافت پر علی ابن ابیطالب متصرف ہو گئے تو اس باب میں اُن کا طرزِ عمل کیا ہوگا اس لئے بھی وہ آپ کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور پورا زور اس پر صرف کر رہے تھے کہ علی ابن ابیطالبؑ کی خلافت ناکام ہو جائے۔ حضرت علی ابن ابیطالبؑ کی اپنی زندگی شروع سے سرمایہ داری کے خلاف تھی۔

انھوں نے اپنے لئے مال و دولت دنیا کی نہ کبھی توقع کی نہ کبھی اس کے حصول کے درپے ہوئے انکے سامنے حضور کی حیات طیبہ کا اُسوۂ حسنہ موجود تھا اس لئے انھیں ہمیشہ یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ لوگوں نے حضورؐ کی سنت کو یک لخت نظر انداز کر دیا ہے اور ہر شخص دنیا طلبی کے چکر میں پھنس کر جادۂ حق سے منحرف ہو چکا ہے حضرت علی ابن ابیطالب کی زندگی زہد و قناعت اور فقر و استغنا کی زندگی تھی وہ لوگوں میں بھی انھی صفات کے جویا اور خواہاں تھے دنیا کی لذتوں اور اور عیش و عشرت کی طرب زائیوں سے وہ ہمیشہ دور دور رہے عہد خلافت میں نان شعیر پر انکا گزارا ان تھا وہ بنی امیہ کے نیک نام خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کے نے ان کے بارے میں کہا تھا

"دنیا سے بے رغبتی میں علی ابن ابی طالبؑ کا کوئی ہمسر نہیں"

(طبقات ابن سعد ۲۹۱)

ابو سفیان کہا کرتا تھا:۔

"علی ابن ابیطالب نے اپنے لئے نہ گھر تعمیر کیا نہ دنیا کا ساز و سامان فراہم کیا" جب آپ نے مدینہ منورہ سے نقل مکانی فرمائی تو کوفہ کے قصر ابیض میں اقامت گزیں ہونے سے انکار فرمایا

اور ایک فقیرانہ جھونپڑی کو اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا بارہا ایسا بھی ہوا کہ آپ کو اپنی تلوار بیچ کر خوراک ولباس کا انتظام کرنا پڑا عقبہ ابن علقمہ کہتے ہیں:۔

''میں ایک بار علی ابن ابیطالب کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اُن کے سامنے دودھ کا پیالہ اور روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے دودھ کا ذائقہ اس حد تک بگڑ چکا تھا کہ مجھے اس کا چکھنا بھی گوارانہ ہوا میں نے تعجب سے پوچھا امیر المومنین! کیا یہ آپ کی خوراک ہے؟ فرمایا کہ اے ابوالجنوب! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے زیادہ خشک روٹی کھاتے تھے اور میرے اس لباس سے زیادہ گاڑھا پہنتے تھے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں حضورؐ کے نقش قدم پر نہ چلا تو آخرت میں کہیں اُن کے شرف صحبت سے محروم نہ ہو جاؤں''۔

ہارون بن عنترہ کہتے ہیں:۔

''ایک مرتبہ میرے والد حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ اُس وقت کوفہ کے قصر نعمان میں تشریف فرما تھے موسم سرما شباب پر تھا اور آپ ایک پرانی سی چادر اوڑھے سردی سے کانپ رہے تھے میرے والد نے عرض کیا ۔یا امیر المومنین! بیت المال میں آپ کا اور آپ کے اہل وعیال کا بھی حق ہے؟ فرمایا ''میں بیت المال کی کسی چیز کے چھونے تک کا روادار نہیں ہوں یہ چادر بھی مدینہ منورہ سے ساتھ لیکر چلا تھا''؟

حضرت علی علیہ السلام کی نجی زندگی کا اسلوب زہد وقناعت کا اسلوب تھا اپنے لئے خود اپنے ہاتھ سے آٹا پیسنے میں کوئی عار محسوس نہ فرماتے تھے بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ سوکھے ٹکڑوں کو اپنے گھٹنے پر مار کر توڑتے اور پانی میں بھگو کر تناول فرماتے لباس کا یہ عالم تھا کہ کپڑوں پر جابجا پیوند لگے ہوئے تھے اسباب دنیا میں حضرت علی ابن ابیطالب کا حصہ رعایا کے ہر فرد سے کمتر تھا۔

اور یہ تاریخ اسلامی کا وہ پر آشوب دور تھا جب لوگوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبت وعقیدت کا وہ پہلے سا جوش وخروش باقی نہیں رہا تھا مال و دولت کا زور تھا جو ممالک مفتوحہ کی سمت سے جزیرہ نمائے عرب کی طرف ان تمام فتنوں کو اپنے جلو میں لئے بڑھا چلا آرہا تھا جن کی بیخ کنی کے لئے اسلام کی انقلاب انگیز تحریک کا ظہور ہوا تھا تاریخ اسلامی کا یہ کیسا الم انگیز سانحہ ہے کہ وہی لوگ اب فتنوں کا شکار ہو رہے تھے جو کل تک اُن کے انسداد کے لئے سرگرم کار رہے تھے اور یوں حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہو رہی تھی جس میں آپ نے مال دنیا دولت کی فتنہ خیزیوں سے ہوشیار رہنے کی صحابہ کو تلقین فرمائی تھی آپ نے فرمایا تھا:۔

''لا الفقر اخشی علیکم ولکن اخاف ان تبسط علیکم للدنیا کما بسطت علیٰ من کما قبلکم فتھلکم کما اھلکم''

مجھے تمہارے فقر وفاقہ سے کوئی اندیشہ نہیں ہے البتہ اس بات کا خطرہ ہے کہ دنیا اپنے پورے ساز وسامان کے ساتھ تم پر امنڈ پڑے کہ جس طرح کہ تم سے پہلی قوموں کو اس نے اپنی لپیٹ میں لیا تھا اور پھر تم بھی انہیں کی طرح تباہ وبرباد ہو کر رہ جاؤ۔

اور یہی ہوا بھی کہ کل تک جو لوگ حضور نبی اکرمؐ کی صحبت سے مشرف ہوتے رہے تھے اور برسہا برس تک حضورؐ کی زندگی کا انداز اپنی آنکھوں سے دیکھتے چلے آئے تھے آج وہ بھی متاع دنیا کی اس طغیانی کے اندر بہتے چلے جا رہے تھے اور انھوں نے زہد وقناعت کا لبادہ اُتار کر امارت وثروت کا جامہ زیب تن کر لیا تھا۔ ایسے میں ایک یکہ وتنہا مجاہد اس سیلاب کے راستے میں بند باندھ رہا تھا۔ علیؑ ابن ابی طالب ایک ایسے طوفان کا رُخ موڑنے چلے تھے جو تمام اخلاقی اور روحانی حدوں کو توڑتا اور پھاندتا ہوا پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنی لپیٹ

میں لے چکا تھا۔ حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ کی یہ ساری تگ ودو ایک کوشش ناکام کے سوا کچھ نہ تھی۔ مگر وہ اپنے فرائض سے غافل نہیں رہے۔ ناکامی انکے مقدر میں لکھی جا چکی تھی مگر تاریخ شاہد ہے انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا اور ہمت کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور زندگی کے آخری لمحوں تک اس طوفان بلاخیز کے خلاف ڈٹے رہے۔

مصر کے نامور مورخ اور نقاد جناب احمد حسن زیات نے اپنی مشہور کتاب تاریخ الادب العربی میں حضرت علیؓ کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

''حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں فتوحات کے باعث دین کی صحیح شکل وصورت باقی نہیں رہی تھی سادگی اور دنیا سے بے رغبتی کا وہ پہلا سا انداز موجود نہیں تھا عامۃ الناس دین کی اس حقیقت سے انجان اور بے خبر تھے جو عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے ابتدائی چند سالوں میں واضح تھی اس لیئے یہ محض دینی سیاست کے بس سے باہر تھا کہ وہ شام میں معاویہ کے مال و دولت اور عراق میں سرمایہ داروں کی عشرت کوشیوں سے مسحور لوگوں کی بداعتدالیوں کو روک سکتی۔ چنانچہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی سیاست درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ ان کی قبا خلافت چاک ہوگئی وہ اپنے محراب عبادت میں ناحق شہید کر دیئے گئے اور انکی حیات وموت ایک ستائی فضیلت اور شہید نفس مطمئنہ کی خونی تاریخ بن گئی پھر انھوں نے اپنا پرجوش اور انقلابی عزم اور بخت نارسا اپنے بیٹوں کو میراث میں دیا۔ چنانچہ حضرت حسنؓ کو خفیہ طور پر زہر کے گلاس نے موت کی نیند سلا دیا اور حضرت حسینؓ اس مظلومیت کے عالم میں نہایت بیدردی سے قتل کر دیئے گئے کہ زمانہ اس واقعہ کی الم انگیزی اور دہشت ناکی سے ہمیشہ لرزہ براندام رہے گا۔

ملوکیت و خلافت کی کشمکش

حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی ناکامی کا ایک سبب ملوکیت وخلافت کی باہمی کشمکش بھی تھی۔ عثمانؓ بن عفان ملوکیت کے لیئے فضا ہموار کر چکے تھے۔ انھوں نے اپنے طرز عمل سے خلافت کی قوت کو بہت حد تک کمزور کر دیا تھا۔ اس لیئے اب یہ بات عملاً ممکن نہیں رہی تھی کہ خلافت کا نظام ملوکیت کے مقابلہ میں کامیاب ہو سکے بنوامیہ کے لیئے ملوکیت کا تخیل نیا نہیں تھا۔ ابوسفیان نے فتح مکہ کے دن اسلامی فوج کی فتح مندیوں کو دیکھ کر حضورؐ کے چچا اور اپنے بے تکلف دوست عباس بن عبدالمطلب سے کہا۔

''تمہارا بھتیجا تو سچ مچ بادشاہ بن گیا ہے۔''

گویا بنی امیہ کی نظر میں اسلام کی دعوت محض حصول اقتدار کا ایک ذریعہ تھی وہ سمجھتے تھے کہ ان کے حریف قبیلہ بنوہاشم نے یہ بازی جیت لی ہے اس ہاری ہوئی بازی کو جیتنے کے لیئے بنی امیہ نے ہر کھیل کھیلا اور ہر حربے سے کام لیا۔

علیؓ ابن ابی طالب اسلام کی چلتی پھرتی تصویر تھے اور معاویہ اپنی خاندانی روایات کا نمونہ تھا۔ علیؓ ابن ابی طالب حالات کے بہاؤ میں بہنے کے لیئے تیار نہ تھے اور معاویہ بن ابو سفیان موقع پرستی اور مصلحت شناسی کو اپنی سیاست کا اصول بنا کر ایک خاص منزل کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے اور وہ منزل تھی بنی امیہ کی بادشاہت جس کا سنہرا خواب ان کے پردادا امیہ نے دیکھا تھا اور جس نے شرمندۂ تعبیر ہونے کا وقت لحظہ بہ لحظہ قریب سے قریب تر ہو رہا تھا اور بالآخر یہ خواب سچا ثابت ہوا اور خلافت الٰہیہ کی بساط پر ملوکیت کا دیو استبداد ننگا ہو کر ناچنے لگا۔ حضرت علیؓ ابن ابی طالب اور عثمان ومعاویہ کا صرف ایک خاندانی تنازعہ نہ تھا

بلکہ دو نظریئے اور دو نظام متصادم تھے ایک طرف بنی امیہ تھے جو ملوکیت کے علمبردار تھے دوسری طرف امیر المومنین سیدنا علیؑ ابن ابی طالب کی مقدس ذات تھی جو اسلام کے عطا کردہ نظریہ خلافت کی حفاظت میں سرگرم عمل تھی۔

مشرق وسطیٰ کے ایک فاضل مورخ رفیق بک نے اپنی دستاویزی کتاب ''اشہر مشاہیر الاسلام فی الحروب السایہ'' میں ملوکیت وخلافت کی اس آویزش کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''الملك طرفان مطلق و مقيدتنار عها على و معاويه فكان على اخر الامراء المقيدين و معاوية اوّل الامراء المطلقين ومع ماعرف من الثانى من الحلم و حسن السياسة و كف يدالظلم الق يبطها عادة الرؤساء والمطلقون فان هذا لم لغين الاته شيئاً عن خلافة على ابن ابيطالب الّذى كان احب الىٰ الاته واسدسبيلا فى مستقبل الام للخلافة الشرعية و خم عقدالرعية كان فى مسلك واحد تتوحد فيه مشابهم السياسته تنيفتح وابرالنارعين الىٰ الملك غيره نوالا هلية وينحسم اصل النزع على السلطان اواسلط على الرعية تسيكون الناس امةواحدة تخفع لقانون واحده وهيهات للمحالمين ذالك بعد مكيدةعمرو هيهات ''

فرماں روائی اور حکمرانی دو نوعیت کی ہوتی ہے، مطلق العنان، بادشاہت اور پابند شریعت حکومت، حضرت علیؑ ابن ابی طالب اور معاویہ بن ابوسفیان کے درمیان باہمی کشمکش در اصل حکومت کی انہی قسموں کا باہمی تصادم تھا۔ علیؑ ابن ابی طالب پابند شریعت حکمرانوں میں

آخری حکمراں تھے اور معاویہ مطلق العنان بادشاہوں میں پہلے بادشاہ، لیکن باوجود ان خوبیوں کے جو معاویہ کے متعلق مشہور کی گئی ہیں مثلاً انکا تحمل، انکی سیاسی مہارت، اور انکا ان مظالم سے اجتناب جو مطلق العنان بادشاہوں کا معمول ہیں، بایں ہمہ، انکی بادشاہت امت اسلامیہ کو امام علیؑ ابن ابی طالب کے خلاف سے مستغنی نہ کرسکی کیونکہ حضرت علیؑ کا طرز حکومت امت کا پسندیدہ طرز حکومت تھا اور انکی خلافت ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کے لیئے فال نیک تھی جس سے شریعت کے اقتدار اعلیٰ اور قانون الٰہی کی بالادستی قائم رہ سکتی تھی اور رعایا ایک ایسے رشتۂ وحدت میں منسلک ہو کر متحد ہو جاتی کہ اپنوں کی حکومت کا راستہ ہمیشہ کے لیئے مسدود ہو جاتا اور ملک وقوم پر غلبہ وتسلط حاصل کرنے کے لیئے جو ہتھکنڈے اختیار کیئے جاتے ہیں ان کی بیخ کنی ہو جاتی اور ملتِ اسلامیہ ایک امت واحدہ کی مانند ایک ہی قانون اسلامی کی مطیع و منقاد ہوتی لیکن افسوس اور صد ہزار افسوس کہ عمرو بن العاص کی دسیسہ کاریوں کی بدولت یہ امید بر نہ آسکی اور ملت اسلامیہ کی عظمت کا خواب ادھورا رہ گیا۔)

چومکھی لڑائی

حضرت علیؑ ابن ابیطالب کو اپنے عہد خلافت میں بیک وقت کئی محاذوں پر جنگ لڑنا پڑی، ایک طرف معاویہ اور انکی ذریت تھی جو اسلام کے خلاف صف آراء تھے اور اسلام کے نظام عدل شہنشاہیت کے استبداد میں بدل دینا چاہتے تھے دوسری طرف طالع آزماؤں کا ایک ٹولہ جو بظاہر غیر جانب دار تھا مگر یہ باطن اپنی قیمت چکا رہا تھا اور اپنے مفاد کو ہر شئے سے مقدم سمجھتا تھا۔

تیسری طرف مذہبی جنون پسندوں کا ایک گروہ ہنگامہ برپا کیئے ہوئے تھا اور یہ

چاہتا تھا کہ علیؑ ابن ابی طالب جیسا امام مجتہد کبیر کا فقیر بنا رہے۔ ان کی مثال موجودہ دور کے ان کٹھملاؤں کی سی تھی جو قرآن وسنت کے مفہوم کو اپنے تنگ نظر تصورات میں محصور رکھنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے اور علم وتحقیق کے لیے ان کا وجود ہر دور میں فتنہ بنا رہا ہے۔

اول الذکر گروہ سے مصالحت کی کوئی صورت اس لیے ممکن نہیں تھی کہ حضرت علیؑ سے انکا اختلاف نظریاتی تھا اور کفر واسلام کی جنگ کی نوعیت اختیار کر چکا تھا۔ معاویہ کی خواہش تھی کہ اسلام چونکہ انکے خاندان کے زوال کا باعث بنا ہے اس لیے اسلام کے تصور حکومت کو ملیامیٹ کر کے بنی امیہ کی بادشاہت کا نظام رائج کیا جائے چاہے اسلام رہے یا مسخ ہو کر رہ جائے انکی انھیں پرواہ نہ تھی۔ دوسرا گروہ جس میں عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ اور اسی قماش کے لوگ تھے۔ یہ بھی حضرت علیؑ کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ حضرت علیؑ سیاسی رشوت دینے کے مطلقاً روادار نہیں تھے ان کے یہاں کسی شخص کے لیے خواہ وہ انکا حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو ناجائز مراعات کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔

تیسرے گروہ سے بھی حضرت علیؑ کی نہیں بن سکتی تھی اس لیے کہ یہ لوگ حق وبصیرت سے یکسر محروم تھے مذہبی جنونیوں کا یہ انتہا پسند گروہ جہل مرکب کا شکار تھا۔ اور دین کی جیسی کچھ تعبیر ان کے ذہنوں میں تھی اس کو برحق کہتا اور اپنے سوا ہر شخص کو باطل پر سمجھتا تھا۔ اس طائفہ کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو سنی سنائی باتوں کو عقائد کا درجہ دے کر بت کی طرح انکی پوجا شروع کر دیتے ہیں ان لوگوں کی انتہا پسندی اور کم سوادی کی بدولت حضرت علیؑ ابن ابی طالب کو بارہا نہایت نازک موقعوں پر زک اٹھانی پڑی اور انکی کامیابیاں ناکامیوں میں تبدیل ہو کر رہ گئیں۔

ان تینوں گروہوں میں سے کوئی بھی ایسا گروہ نہیں تھا جو علیؑ ابن ابی طالبؑ جیسے متقی،

خدا ترس اور عابد وزاہد شخص کے معیار تقویٰ پر پورا اتر سکتا اور مصالحت کی مطلوبہ شرائط کو پورا کرنے کا اہل ہوتا اس لیے ہر حریف کی فتنہ انگیزی کے انسداد کے لیے بجز جنگ کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا اور اس پیہم لڑائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں معاملات کو زبردست پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

مسندِ امامتِ کبریٰ کا صدر نشیں

حضور ختمی مرتبت فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"قدرت الٰہی کی کرشمہ زائیوں نے میرے نور سے کائنات کی تخلیق کا آغاز کیا۔ میں، علیؑ ابن ابی طالب، فاطمہؑ اور حسنؑ وحسینؑ ایک ہی سرچشمہ وجود سے ظہور پذیر ہوئے۔"

(ابن ابی شیبہ، مسند ابی لیلیٰ، مستدرک حاکم)

محمد کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور امام علی مرتضیٰؑ دونوں ایک ہی سلسلۃ الذہب کی دو کڑیاں ہیں ایک منصب نبوت پر فائز ہوا دوسرا مسندِ امامت پر جلوہ آرا ہوا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دورِ نبوت اختتام پذیر ہوا اور علیؑ ابن ابی طالب سے امامت کبریٰ کا سلسلۂ آغاز ہوا۔ دونوں کی تخلیق کا سرچشمہ ایک تھا۔ دونوں کی تربیت کا ماحول یکساں تھا۔ دونوں ایک ہی خانوادۂ عظمت کے چشم وچراغ تھے۔ اس لیے دونوں عظیم شخصیتوں کے درمیان کامل ہم آہنگی تھی۔ عظمت انبیاء کے دائرۂ قدسیہ کا مرکزی نقطہ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی ہے اور رسالت محمدیہ کے دائرۂ عظمت میں امامت کا اولین نقطہ علیؑ ابن ابی طالب کی شخصیت گرامی ہے۔

حضور سرور کائنات (بابانا وامہاتنا) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد باب نبوت و

رسالت ہمیشہ کے لیئے بند ہو گیا لیکن امامت کبریٰ کا منصب جلیل قائم رکھا گیا تا کہ نسل انسانی کی ہدایت برقرار رہے۔

ہجرت نبوی سے تیس برس قبل خدا کے مقدس گھر کی چہار دیواری کے اندر امام علیؑ ابن ابی طالب کی ولادت باسعادت ہوئی۔ وہ پہلے اور یقیناً آخری شخص ہیں جنھیں اس اعزاز سے قدرتِ خداوندی نے نوازا حرم کعبہ کا معمار اول ابراہیم پوری نسل انسانی کا اولین امام تھا اور خدا کا یہ مقدس گھر کائنات انسانی کی روحانی اور مذہبی پیشوائی کا اولین قبلہ قرار پایا اور اس گھر میں پیدا ہونے والا بچہ بڑا ہو کر ابراہیم کی مسندِ امامت کبریٰ کا جانشین بنا ابراہیم علیہ السلام کے فرزند گرامی اسماعیلؑ کی رسالت ونبوت کا وارث خاندان بنو ہاشم کا ایک معزز فرد ہوا اور ب امامتِ ابراہیمی کے منصب کی وراثت بھی اسی محترم خاندان کے ایک فرد فرید کے حصہ میں آئی۔

نسل بنی عدنان میں قبیلہ بنو ہاشم کو اللہ تعالیٰ نے نبوت اور امامت دونوں کا اعزاز عطا فرمایا محمدؐ امام الانبیاء ہیں اور علیؑ امام اولیاء ہیں۔

توحید کے مرکز اول، کعبۃ اللہ کی بنیاد ابراہیمؑ نے رکھی لیکن جب اس حرم مطہر کو شرک وبت پرستی کی آلودگیوں سے ملوث کر دیا گیا تو حضور ختمی مرتبت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ ابن ابی طالب سے فرمایا کہ وہ میرے دوش پر سوار ہو کر حرم مطہر کو شرک و بت پرستی کی آلائشوں سے پاک کریں۔ حضرت علیؑ کی امامت کا یہ پہلا باضابطہ اعلان ہے جو زبان نبوت سے صادر ہوا یہ اس بات کا اظہار تھا کہ اب نسل انسانی کی امامت علیؑ ابن ابی طالب اور اسکی اولاد امجاد کے لیئے مخصوص کر دی گئی۔

یہ اعزاز بھی علی ابن ابی طالب کے حصہ میں آیا کہ وہ خاندان بنی ہاشم کے پہلے فرد

جو نجیب الطرفین ہاشمی تھے انھیں اپنے
دادھیال اور ننھیال دونوں طرف سے اس معزز اور نامور خاندان کی شاندار روایات ورثہ میں ملی تھیں شرافت، حسب ونسب، بہادری، جوانمردی، مروت وذہانت وفطانت کے لحاظ سے بنو ہاشم عرب کا ایک ممتاز قبیلہ تھا اور جسمانی قوت کے اعتبار سے اس خاندان کے لوگ نمایاں کے حامل تھے۔ حضرت علی ابن ابی طالب کے والد ماجد کا نام عبد مناف اور کنیت ابو طالب تھی اور عبد المطلب بن ہاشم کے فرزند تھے حضرت علیؑ کی والدہ محترمہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔

علی ابن ابی طالبؑ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ پیدائش سے لیکر موت تک اُن کا سر خدا کے سوا کبھی کسی کے سامنے خم نہیں ہوا اور اُن کی پیشانی بندگی غیر سے کبھی آلودہ نہیں ہوئی وہ کاشانہ نبوت میں پروان چڑھے اور آغوش نبوت کی تربیت کا فیضان تھا کہ وہ اپنی عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ زیرک، سمجھدار اور ہوشیار تھے۔

ابھی اُن کی عمر سولہ سترہ برس سے زیادہ نہ تھی کہ اُنھیں قریش کے ایک اجتماع میں شریک ہونے کا موقع ملا، یہ اجتماع حضورؐ کے پیغام نبوت کا سننے کے لئے منعقد ہوا تھا کہ قریش کے بڑے بڑے سردار اس مجلس میں موجود تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں دین حق کی دعوت دی اور فرمایا "کوئی ہے جو اس مقدس پیغام حق کی تبلیغ واشاعت میں میرا مدد گار بنے۔ سب پر سکوت مرگ طاری ہو گیا اچانک اس سناٹے کو چیرتی ہوئی علی ابن ابی طالب کی آواز بلند ہوئی" انا نصیرک "(طبری ص ۲۷۲) (میں آپ کا ساتھ دوں گا)

ایک ایسے ماحول میں جہاں بڑے بڑوں کو لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی علی ابن ابی طالب کی ذہانت وفطانت اور بے مثال شجاعت وبسالت تھی جس نے اُن کے لبوں کو جنبش اضطراب

بخشی اور انھوں نے پورے ماحول سے بے نیاز ہو کر حضور کی دعوت پر لبیک کہا۔

اس جرأت کا جواب ایک خندہ و استہزا کے سوا کچھ نہ تھا سرداران قریش ایک نو عمر بچے کی اس جرأت پر طنز آمیز ہنسی ہنس رہے تھے لیکن تقدیر کا فیصلہ علی ابن ابیطالب کے حق میں تھا۔ وقت نے ثابت کر دکھایا کہ اس بچے کی حمایت و نصرت ان تمام سرداروں کی مخالفت پر بھاری رہی۔ حضرت علی ابن ابی طالب کے بارے میں ان سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ جسمانی قوت کے لحاظ سے اپنا کوئی حریف و ہمسر نہیں رکھتے تھے بچپن ہی سے آپ کے جسمانی قویٰ نہایت مضبوط تھے جوانی کی طرح بوڑھاپے میں بھی یہ دم خم قائم رہے وہ بڑے تندرست توانا اور مضبوط کاٹھ کے مالک تھے ساٹھ سال کی عمر میں بھی انکی صحت و توانائی نوجوانوں کے لئے قابل رشک تھی پہلوانی کے ہر داؤں پیچ سے واقف تھے بڑے سے بڑا پہلوان انھیں زیر نہیں کر سکا میدان جنگ میں حریف کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اُٹھاتے اور زمین پر پٹخ دیتے کسی کی کلائی پکڑ لیتے تو اُس کا سانس رُکنے لگتا (الریاض النضرہ) وہ ہمیشہ اپنے حریف پر غالب رہے اور جس کسی نے بھی انھیں مبارزت کے لیئے للکارا اور وہ انکے ہاتھوں سے قتل ہونے سے بچ نہیں سکا ایسے ایسے بھاری بھرکم پتھروں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے تھے کہ جنھیں بیک وقت کئی آدمی ہلا نہیں سکتے تھے۔ قلعوں کے بڑے بڑے دروازوں کو اپنے بازوؤں کی قوت سے اُکھاڑ پھینکتے تھے۔ آواز کی گھن گرج کا یہ عالم تھا کہ جب نعرہ بلند کرتے تو بڑے بڑے سورماؤں کا زہرہ آب ہو جاتا تھا اپنی جسمانی اور طبعی خصوصیات کیساتھ علی ابن ابی طالب، دل کے بہادر، بے باک اور نڈر بھی تھے اور جسمانی طاقتور حریف کا سامنا کرتے ہوئے مطلقاً گھبراہٹ محسوس نہیں کرتے تھے عرب کے بعض نامی گرامی شہسواروں کو جن میں ولید بن ربیعہ عمر بن ود اور مرحب جیسے لوگ شامل ہیں آپ نے نیچا دکھایا اس باب میں اپنوں

اور بیگانوں میں اُن کی عظمت مسلّم تھی اور عربوں کے ذہن میں یہ تصور راسخ ہو کر رہ گیا تھا کہ علی ابن ابی طالب کی تلوار ایک قضائے مبرم ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں گویا اُن کے ہاتھوں اُن کے حریف کا قتل ہونا ایسا یقینی امر تھا جیسے وہ طبعی موت مر گیا ہو۔

لا فتیٰ الّا علیؑ لا سیف الّا ذو الفقار

حضرت علی ابن ابی طالب کی بہادری اور ان کی شجاعت محض سطحی قسم کا ایک جذبہ نہ تھا بلکہ وہ انکی فطرت کا ایک حسن تھا اور ان کی ایک ایک ادا سے نمایاں تھا وہ ان تمام خوبیوں سے بہرہ ور تھے جو شجاعت و جوانمردی کا لازمہ تصور کیجاتی ہیں۔ ہنگام جنگ ہو یا صلح کا ماحول وہ کبھی غیر انسانی طور طریقوں سے اپنے حریف پر غلبہ پانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ عمرو بن العاص جو حضرت علیؑ ابن ابی طالب کا سب سے خطرناک دشمن تھا اور جس کی دسیسہ کاریوں کی بدولت آپ کو کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگِ جمل مین جب آپ کی تلوار کی زد پر آیا تو ڈر کے مارے بالکل ننگا ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ عربوں میں یہ بات اعتراف شکست کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ آپ نے اس کی ذلت کا یہ انداز دیکھا تو فوراً اپنا رُخ دوسری طرف پھیر لیا۔ حالانکہ اگر اس موقع پر آپ اس مردود کا قصہ پاک کر دیتے تو آپ کو بہت سی الجھنوں سے نجات مل جاتی مگر شکست خوردہ حریف کو قتل کرنا ایک بہادر اور جوان مرد انسان کی شایان شان نہیں اس لیئے آپ نے اسے موقع دیا کہ وہ چند روزہ زندگی کے کچھ اور مزے لوٹ لے۔ جنگِ صفین میں امیر معاویہ کے لشکر کا ایک حمیری جوان کریز بن الصباح زرہ بکتر پہنے ہوئے اور جنگ کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں نکلا اور "ھل من مبارز" کوئی ہے مقابل، کی آواز بلند کیا، یکے بعد دیگرے تین آدمی اسکے مقابلہ پر نکلے اور

مارے گئے عنقریب تھا کہ حضرت علیؑ کے لشکر میں بد دلی پھیل جائے اس وقت امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب خود اس نوجوان کے مقابلہ کے لیئے میدان میں تشریف لائے۔ تیغ یداللّٰہی کے ایک ہی وار نے اس حمیری نوجوان کا سرتن سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے تین مرتبہ "ھل من مبارز" کا نعرہ بلند کیا لیکن کوئی نہ تھا جو علیؑ ابن ابی طالب کا حریف بننے کی جرأت کرتا۔ جنگِ جمل میں انھوں نے دیکھا کہ طلحہ و زبیر ان کے حریف ہیں تو وہ نہتے ہو کر میدان میں تشریف لائے اور زبیر کو آواز دی۔ حضرت عائشہ نے یہ سنا تو چیخ اٹھیں "ہائے افسوس زبیر کے دن پورے ہو گئے"۔

حضرت عائشہ کو یقین تھا کہ علیؑ سے مقابلہ میں زندہ بچنا ممکن نہیں خواہ علیؑ ابن ابی طالب نہتے ہوں اور انکا حریف کیسا ہی بہادر، شہ زور اور سورما کیوں نہ ہو۔

صاف دل و پاک نہاد

حضرت علیؑ ابن ابی طالب جذبہ خود اعتمادی اور احساس سے ہمیشہ سرشار رہتے تھے۔ میدان جنگ میں خود اعتمادی اور احساس برتری ایک کاایسا ہتھیار ہے جس کے بعد اسے کسی دوسرے ہتھیار کی ضرورت نہیں رہتی۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی (اقبال)

حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی یہی خود اعتمادی تھی کہ انھیں ہنگامۂ جنگ کی رزم آرائی سے علم کے خلوت کدے میں لے گئی اور وہ اس میدان میں بھی اپنے ہمعصروں سے بازی لے گئی۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالب کسی بات کو راز نہیں رکھتے تھے یا یوں کہیئے کہ جو کچھ ان

کے دل میں ہوتا تھا وہی کچھ زبان پر تھا اس لیئے وہ کسی سے بھی دل کی بات چھپاتے نہیں تھے اور اپنے نظریات کے اظہار میں مصلحت کوشی کو گناہ عظیم گردانتے تھے، ان کے اخلاق کریمہ کا درخشاں عنوان اور انکی سادگی، ان کا خلوص اور انکی بے تکلفی تھی۔ وہ اپنے مداحوں کے منہ سے کوئی ایسی بات سننے کے روادار نہ تھے جس میں تصنع کی آمیزش ہو اگر کبھی کوئی شخص انکی تعریف میں رطب اللسان ہوتا اور وہ محسوس فرماتے کہ یہ تصنع برت رہا ہے تو اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیتے کہ:

"میرے متعلق جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس سے فروتر ہوں اور بارے میں جو تمہاری حقیقی رائے ہے اس سے کہیں بہتر ہوں۔" (عبقریۃ الامام اعباس محمود العقاد)

عجب اور خود پسندی سے آپ کو سخت نفرت تھی اپنے عزیزوں اور دوستوں کو نصیحت فرماتے کہ خود پسندی سے احتراز کریں کہ عقل و دانش کے لیئے اس کا وجود سب سے بڑا فتنہ ہے۔ عزت نفس اور "پاس ناموس" کا احساس ان کی طبیعت پر غالب تھا اور یہی وہ جذبہ تھا جو انھیں اپنے سے کمتر حریفوں کے اوچھے حربوں کا جواب دینے سے روکتا تھا۔ حضرت حسنؑ کو جو نصیحتیں فرمائیں ان میں "پاس ناموس" پر سب سے زیادہ زور دیا فرمایا:

"وانجز نفسك عن كل دنية و ان ساقتك الى الرغائب فانك لن تعاض بما تبذل من نفسك عوضا وتكن عبد غيرك و قد جعلك الله حرا وما خير اريخال الابشرو ليس لا ينال الا بعسر"

اپنی شخصیت کو ہر گھٹیا حرکت سے بلند رکھو خواہ اس گھٹیا حرکت کے ذریعہ تمھیں اپنی پسندیدہ چیزوں کے حصول کا یقین ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اپنی عظمت سے دستبردار ہو کر جو کچھ بھی تم حاصل کرو گے وہ اس عظمت کا بدل نہیں بن سکے گا۔ کسی کے دست نگر اور محکوم نہ ہو کیونکہ اللہ

نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے اور جو بھلائی وشر کے ذریعے دستیاب ہو وہ کبھی بہتر ثابت نہیں ہو سکتی اور جو دولت تنگدستی کے ذریعے ملے اسکا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

(طبری، ص ۱۲۷۷)

مثالی شخصیت

ان تمام صفات ومحاسن کے باوصف حضرت علیؓ ابن ابی طالب انتہائی متواضع اور منکسر المزاج شخص تھے۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ۔

کان علی یمشی فی الاسواق وحده وهو خلیفة یرشد الضال ویمر بالبیاع والبقال فیفتح علیه القرآن ویقرا، تلك الدار الآخرة نجعلها للذین لایریدون علوا فی الارض ولافسادا'' ثم یقول نزلت هذه الآیه فی اهل العدل والتواضع من الولاة واهل الاموال ومن سائر النّاس۔'' (البدایہ والنہایہ، ابن کثیر)

حضرت علیؓ ابن ابی طالب اپنے عہد خلافت میں بازاروں میں تنہا گھومتے پھرتے تھے۔ راستہ بھولے ہوؤں کی رہنمائی فرماتے اور کمزوروں کی دستگیری فرماتے دوکاندار اور کاروباری لوگوں کے پاس سے گزرتے تو انھیں قرآن مقدس کی یہ آیت یاد دلاتے کہ:

تلك الدار الآخرة نجعلها للذین لایریدون علواً فی الارض ولا فساداً والعاقبة للمتقین۔

وہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لیئے تیار کیا ہے جو زمین پر نہ تو تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں نہ فتنہ وفساد کی آگ بھڑکاتے ہیں اور انجام خوش انہی کے لیئے رہے جو متقی ہوں۔

آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مصداق وہ دولت منداور وہ سب لوگ ہیں جو تواضع اختیار کرتے ہیں اور عدل وانصاف کی راہ پر گامزن ہیں۔

غلط کار مشیروں، خوشامدیوں اور جی حضوریوں کو سخت ناپسند فرماتے تھے اور اپنے عمال کو بھی ایسے لوگوں سے بچنے کی ہدایت فرماتے۔ محمد بن ابوبکر کو وصیت فرمائی کہ:

''کسی کنجوس، بزدل اور لالچی شخص کو کبھی اپنا مشیر مت بناؤ کنجوس شخص تمھیں فیاضی سے روک دے گا، بزدل تمہارا حوصلہ پست کر دے گا اور لالچی تمھاری برائیوں کو بھی خوبیاں بنا کر پیش کرے گا۔

اور پھر آخر میں ان تینوں خصلتوں کے بارے میں ایک جامع تبصرہ فرمایا جو آب زر سے لکھنے کا قابل ہے۔ ارشاد ہوا:

''ان البخل والجبن والحرص غرائز شتی یجمعها السوء الظن بالله۔

کنجوسی، بزدلی اور لالچ تین مختلف خصلتیں ایک ہی فکری گمراہی کی پیداوار ہیں اور وہ ہے اللہ کی ذات پر بے اعتمادی اور اس کے بارے میں بدگمانی۔

یہی ایک ارشاد گرامی، حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی پوری زندگی کا آئینہ دار ہے اور ان کی پاکیزہ حیات مستعار کا ایک ایک واقعہ اس امر کی شہادت دے گا کہ ان تینوں برائیوں میں سے کسی ایک برائی کی انکی شخصیت پر ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں پڑتی تھی۔

عظمت کردار

امیر المومنین سیدنا علیؑ ابن ابی طالب کا نظام حکومت وعدل ومساوات اور مروت وانصاف کے اسلامی اصولوں پر استوار تھا۔ وہ اسلامی مقامی ریاست کے بے مثال خلیفہ تھے۔ انھوں نے اپنی حکومت کی بنیاد اعلیٰ اسلامی اخلاق پر رکھی تھی۔ اس بارے میں ان کے بارے میں ان کے بدترین ناقد بھی انکی راست بازی اور حسن نیت پر کوئی حرف گیری نہیں کر سکے۔ حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے ان گورنروں کو ایک ایک کر کے ان کے عہدہ ومنصب سے علحدہ کر دیا۔ جن کے بارے میں لوگوں کو شکایت تھی کہ وہ بیت المال میں بددیانتی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آپ نے اپنے عہد خلافت میں ان جاگیروں کو واپس لے لیا۔ جو عثمان بن عفان نے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کی تھیں اور جن کی وجہ سے مسلمان حضرت عثمان سے نالاں ہوئے تھے۔

حضرت امام عالی مقام سیدنا امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی عظمتِ کردار کے لیئے یہی ایک واقعہ بطور ثبوت کافی ہے کہ آپ نے اپنے دور خلافت میں فدک کی اس زمین کو جو خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت کے لیئے مخصوص فرمائی تھی اور جسے ابوبکر وعمر کے عہد میں اہل بیت سے چھین لیا گیا تھا۔ واپس لینے کے لیئے کوئی اقدام نہیں فرمایا ایک مدت کے بعد دور بنی امیہ کے خلیفہ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس قطعۂ زمین کو اس کے اصل وارثوں کو سپرد کر دیا۔ سیدنا علیؑ ابن ابی طالب نے اپنے گورنروں اور اعمال حکومت کو وقتاً فوقتاً جو ہدایت جاری فرمائیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شریعت الٰہیہ کے خود بھی پابند تھے اور اپنے ماتحتوں کو بھی اس پر کاربند ہونے کی تاکید فرماتے تھے ایک موقعہ

پر آپ نے گورنروں کو لکھا کہ:

"لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آؤ۔ ان کے ساتھ برابری کا سلوک اور شفقت آمیز برتاؤ کرو۔ ہر شخص کی جائز مانگ پوری کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ لوگوں سے محاصل وصول کرتے وقت ان پر سختی نہ کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ محاصل کی ادائگی کے لیئے ان کو اپنا گھریلو سامان یا سواری کے جانور فروخت کرنے پڑیں کسی شخص کو خراج کی رقم روانہ کرنے پر کوڑوں کی سزا مت دو۔"

محصلین اور عاملین زکوٰۃ (مالیہ اور زکوٰۃ) وصول کرنے والے عملے کو تاکید کی تھی کہ۔

"مالیہ اور زکوٰۃ وصول کرتے وقت اس بات کا بطور خاص خیال رکھو کہ تمہارے طرز عمل سے کسی شخص کو شکایت اور برہمی کا موقع نہ ملے۔ لگان وصول کرتے وقت زمین کی حالت اور فصل کی نوعیت کو ملحوظ رکھو۔ یہ بات یاد رکھو کہ اگر تم نے لوگوں کے ساتھ سختی اور جبر کا وطیرہ اختیار کیا تو زمینیں ویران ہو جائیں گی۔ اور گاؤں اجڑ جائیں گے۔"

(طبری، ج ۶، ص ۲۱۲)

رعایا کی عزت نفس کا اس قدر پاس تھا کہ گورنروں کو ہدایت تھی کہ "حکمراں اس لیئے نہیں ہوتا کہ وہ اپنی رعایا کی ہتک حرمت کرے یا ان کی بے عزتی اور رسوائی میں دلچسپی لے۔ اس کا کام تو پردہ پوشی اور اصلاح خلق ہے"

اپنے معتمد اور وفادار ساتھی "اشتر نخعی" کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا:

"اپنے مقرر کردہ حکام پر کڑی نگرانی رکھو تاکہ بے راہ رو نہ ہو جائیں باحیا اور پاک باز گھرانوں کے نیک افراد کو حاکم بناؤ کیونکہ اس قسم کے لوگوں میں سیر چشمی، خوش اخلاقی اور

بلند ظرفی موجود ہوتی ہے۔"

امیر المومنین حضرت علیؓ ابن ابی طالب کا اپنے گورنروں پر احتساب بڑا سخت تھا اس لیئے آپ کے عہد میں گورنری پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر بن گئی اور لوگ گورنر بنتے ہوئے ہچکچاتے تھے بصرہ کے گورنر عثمان بن حنیف کے متعلق انھیں پتہ چلا کہ وہ کسی شخص کی دعوت میں شریک ہوئے ہیں اس پر آپ نے اُنھیں ایک زوردار تہدیدی مراسلہ تحریر فرمایا کہ۔

"جس ملک میں غریبوں کو نظر انداز کیا جاتا ہو اور امیروں کی پرستش ہو وہاں ایسی دعوتوں میں کسی گورنر کی شرکت کا کوئی جواز نہیں ہے آئندہ ہشیار رہو"

(عبقریۃ الامام عباس محمود العقاد)

بیت المال کی رقوم واملاک کی دیکھ بھال کا بڑا اہتمام فرماتے تھے اور عمال کو اس کے حساب کی درستگی کے بارے میں خاص طور پر تاکید فرماتے تھے حضرت علیؓ کے عہد حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معاملات حکومت میں ہر بات کو دین کے پیمانے سے ناپتے تھے اور سچائی کے مقابلہ میں اپنی یا لوگوں کی پسند و ناپسند کو مطلقاً خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اُن کی زرہ گم ہوگئی انھوں نے وہی زرہ ایک عیسائی کے پاس دیکھی تو اُسے پکڑ کر قاضی شریحؒ کی عدالت میں لے گئے ۔ عیسائی کا اصرار تھا کہ زرہ اُس کی ہے قاضی شریحؒ نے ضابطہ کے مطابق امیر المومنین نے زرہ کی ملکیت کا ثبوت مانگا آپ نے اپنے بیٹے حسنؑ اور اپنے غلام قنبر کی شہادت پیش کی جسے عدالت نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا فیصلہ عیسائی کے حق میں ہوا عیسائی نے وقت کے سب سے بڑے حاکم کو اپنے مقابلہ میں بے بس پایا تو اسلام کی صداقت وعدل سے متاثر ہوا اور مسلمان ہو گیا اور عرض کیا امیر المومنین یہ زرہ آپ کی ہے

میں نے جنگ صفین میں اُسے آپ کے خاکستری اونٹ سے چرایا تھا" فرمایا کہ اب جبکہ تم مسلمان ہو گئے ہو۔ یہ زرہ تمہاری ہوگئی" اور اس طرح ایک عیسائی حضرت علیؓ کے جاں نثار وں کی صف میں شامل ہو گیا۔ (طبری، ابن سعد، اصابہ، الاستیعاب لابن عبدالابر، مسعودی، مروج الذہب)

انسانی صفاتِ کمال کا جامع

حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ فنون حرب کے ماہر تھے ان کی فوجی صلاحیتیں اور عسکری مہارت انکی عظمت کا امتیازی پہلو ہے۔ جنگِ جمل مین جب آپ نے دیکھا کہ لوگ حضرت عائشہ کے اونٹ کے اردگرد مردانہ وار جانیں قربان کر رہے ہے تو آپ نے اونٹ کی کونچے کاٹ دینے کا حکم صادر فرمایا اور اس طرح چشم زدن مین جنگ جیت لی۔

جنگ میں غیر انسانی طور طریقوں سے حریف کو زیر کرنے اور اس پر غلبہ پانے کی کوشش کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ اپنی بے مثال شجاعت وبسالت کے باوصف آپ نے کبھی جنگ میں پہل نہیں کی۔ اپنے بیٹے حسنؑ کو نصیحت فرمائی:

"کبھی کسی کو از خود جنگ کے لیئے مت للکارو لیکن اگر دشمن تمہیں دعوت مبارزت دے تو ایک لمحہ کا توقف کیئے بغیر اس کے مقابلہ میں نکل آو کیونکہ جو شخص جنگ کی طرح ڈالتا ہے وہ حد سے تجاوز کرنے والا ہمیشہ منہ کے بل گرتا ہے۔"

انھیں علم ہوا کہ خوارج کا گروہ ان کے لشکر سے کٹ کر خود انکے مقابلہ میں صف آرائی کے لیئے پر تول رہا ہے تو آپ نے ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ اس فتنہ کو آغاز ہی میں کچل دینا ضروری ہے ورنہ بعد مین سخت دشواری پیش آئے

گی تو آپ نے فرمایا:

"لڑائی میں پہل میری طرف سے نہیں ہوگی لیکن اگر یہ لوگ اپنی جارحانہ سرگرمیوں سے باز نہ آئے تو پھر میں ان سے نپٹ لوں گا۔"

آپ لڑائی سے پہلے ہمیشہ دشمن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے اور صلح و امن کے لیے اپنی سی کوششوں سے دریغ نہ فرماتے لیکن امن و آشتی کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ جب خود سر حریف کی طرف سے جھٹک دیا جاتا تو شمشیر بدار پر اس ہاتھ کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی۔

حضرت علیؑ اپنے لشکر کو عموماً پانچ حصوں میں تقسیم کرتے اور میدان جنگ میں فوجوں میں ترتیب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے جنگ میں کبھی شکست نہیں کھائی اور ہر معرکہ میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ اپنے سپہ سالاروں کو آپ نے وقتاً فوقتاً جو ہدایت جاری فرمائیں ان سے آپ کی عسکری مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فوجی کمانڈروں کو محاذ جنگ پر روانہ کرتے وقت انھیں ہدایت فرماتے کہ: "جب کسی جگہ پر پڑاؤ کرو تو اونچی جگہ کا انتخاب کرو، پہاڑ کے دامن میں ایسی سمت جہاں دریا تمہارے عقب میں ہو تا کہ تم پوری طرح اپنا دفاع کر سکو۔ ہمیشہ ایک یا دو سمت سے حملہ کرو۔ لشکر کے عقبی حصہ میں ایسے نگراں مقرر کرو جو تمہیں اچانک حملہ سے خبردار کر سکیں۔ فوج کا ہراول دستہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور فوج کی کامیابی یا ناکامی کا سارا دارومدار اسی پر ہوتا ہے اس لیے اس کے لیے ایسے سپاہی منتخب کرو جو تمہیں اچانک حملہ سے خبردار کر سکیں۔ فوج میں نظم و نسق (ڈسپلن) کا خاص خیال رکھو پڑاؤ ڈالتے وقت یا روانگی کی حالت میں تمہاری صفوں میں انتشار اور پراگندگی نہیں ہونی چاہیے۔ رات کو سوتے وقت تیروں کو اپنے پاس رکھو تا کہ اچانک حملے یا شب خون کی صورت میں تم اپنا دفاع کر سکو سونے سے پہلے کلی یا غرارہ کر لیا کرو۔ رات کے پہلے حصے میں سفر سے گریز کرو کیونکہ یہ وقت آرام کا

ہے اور رات اللہ تعالیٰ نے آرام کے لیے بنائی ہے۔"

علم و عمل کا واحد سنگم

حضرت علی کرم اللہ وجہہ صرف عمل کے اعتبار سے ایک مثالی مسلمان نہ تھے بلکہ علم و بصیرت کے لحاظ سے بھی وہ نمونہ کے آدمی تھے۔ فقہاء و متکلمین اسلام کی صف میں علیؑ ابن ابی طالب کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انھوں نے دین کو محض عبادات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے غور و فکر اور سوچ بچار کا ایک جاندار اور دلچسپ موضوع بنا دیا۔ ان کے زمانہ میں نامور معاصر فقہاء کی کمی نہ تھی۔ لیکن وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے خالص علمی اور منطقی طرز استدلال سے مذہب کے رنگ رُخ کو اجالا اور نکھارا اور اسلامی تعلیمات کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے فلسفیانہ اور حکیمانہ اسرار و رموز سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ اُمورِ دینیہ میں بہت کم مسائل ایسے ہوں گے جن میں حضرت علیؑ کے افکار کو ترجیحی مقام حاصل نہ ہو، ہر مکتب فکر کے علماء نے ان کی ذات سے استفادہ کیا ہے اور انھیں علم و نظریات کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ علم توحید و رسالت ہو یا علم عقائد و کلام، اُمور فقیہہ ہوں یا مسائل شرعیہ، اصول فصاحت و بلاغت ہوں یا فن شعر و ادب ان کی ذات ہر جگہ امام کی حیثیت سے جلوہ گر ہے۔ خارجی ہوں یا رافضی، شیعہ ہوں یا سنی، ناصبی ہوں یا قاطبی، صوفیہ ہوں یا فلسفی، فوجوں کے سپہ سالار ہوں یا حکومت و سلطنت کے ارباب حل و عقد، سب نے اپنے افکار و نظریات کی تائید کے لیے ان سے اکتساب فیض کیا ہے اور سب کی نگاہیں انھیں کی بھاری بھرکم شخصیت کی طرف اٹھتی ہیں اس اعتبار سے وہ نہ صرف امام بلکہ امام الائمہ ہیں۔۔۔ اسی بناء پر باب مدینۃ العلم کا خطاب انکی قامت موزوں پر راست آتا ہے۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالب اسلام میں علم کلام کے مئوسس اول ہیں۔ بعد میں آنے والے تمام متکلمین نے انھیں کی استوار کی ہوئی بنیادوں پر اپنے اپنے فکری مکاتب کی عمارتیں قائم کیں۔ ابن ابی الحدید نے نہج البلاغہ کی شرح میں اس مفصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ تمام، قابل ذکر علماء نے علیؑ ابن ابی طالب کے خوان علم و فضل سے خوشہ چینی کی ہے۔

واصل بن عطاء کو جو متکلمین اسلام کے گروہ کا سرخیل ہے۔ ابو ہاشم عبداللہ بن محمد حنفیہ کے توسط سے حضرت علیؑ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ اشاعرہ کا امام ابوالحسن علی ابن ابی بشر الاشعری، ابوعلی ابجائی کا شاگرد تھا اور جبائی جو معتزلہ کے امام ہیں واصل بن عطاء کے شاگرد تھے فقہ میں ابوحنیفہ کی نسبت امام جعفر صادق علیہ السلام کے واسطے سے حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے ساتھ قائم ہے۔ اس توسط سے شافعی ابو یوسف، محمد اور احمد بن حنبل کا سلسلہ بھی آپ پر منتہی ہوتا ہے۔ امام دارالہجر مالک بن انس، ربیعہ الرائے کے شاگرد ہیں۔ ربیعہ کے استاد عکرمہ تھے، عکرمہ نے عبداللہ بن عباس سے استفادہ کیا اور عبداللہ بن عباس حضرت علیؑ کے شاگرد رشید تھے۔ عبداللہ بن عباس سے کسی نے پوچھا۔ آپ کے علم کو آپ کے ابن عم کے علم سے کیا نسبت ہے؟ فرمایا جیسے سمندر کے مقابلہ میں بارش کا ایک حقیر قطرہ!

یہی حال دیگر ائمہ اجتہاد کا ہے کہ ان سب نے اپنی اپنی حیثیت و ظرف کے مطابق علم کے اس بحر ذخار سے سیرابی حاصل کی۔ مسائل فقہیہ میں حضرت علیؑ ابن ابی طالب کو مجتہدانہ دسترس حاصل تھی۔ عمرؓ کو جب کسی فیصلہ میں کوئی دشواری پیش آتی تو بے اختیار آپ کی طرف رجوع فرماتے۔ عمرؓ کے زمانہ میں ایک عورت کا مقدمہ پیش ہوا جس نے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اس کے نتیجہ میں حاملہ ہو گئی تھی۔ عمرؓ نے اس پر حد نافذ کرنی چاہی۔ حضرت علیؑ نے انھیں روک دیا اور فرمایا:

"وضع حمل کے بعد عورت پر حد قائم کی جائے کیونکہ اس کے پیٹ میں معصوم جان پرورش پا رہی ہے اس کا اس گناہ میں کوئی حصہ نہیں ہے۔"

غالباً یہی وہ موقعہ تھا جب حضرت عمر نے بے ساختہ وہ فقرہ کہا جو حضرت علیؑ کی وجاہت علمی پر زبردست شہادت ہے کہ:

"لولا علی لهلك عمر" اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر اپنے غلط فیصلے کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے۔ (طبری، ابن ابی الحدید)

و ملیحة شهدت بها ضراتها والفضل ماشهدت به الاعداء

ایک خوبصورت عورت جس کے حسن کا اعتراف اس کی سوکنوں تک کو ہے اور خوبی وہی ہے جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف ہو۔

علم حساب و ہندسہ میں حضرت امام عالی مقام کو مجتہدانہ بلکہ معجزانہ مہارت حاصل تھی۔ فقہ کی مشکل صنف فرائض یا فن توریث میں ان کی فطانت و ذہانت ضرب المثل ہے بالخصوص ایک ایسے زمانہ میں جب کے اس علم کو گورکھ دھندے سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ وہ وراثت کے مسائل کو برجستہ اور بلا تامل حل فرما دیتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک عورت نے ان سے شکایت کی کہ میرا بھائی چھ سو دینار چھوڑ کر مرا ہے لیکن میرے حصہ میں صرف ایک دینار آیا ہے آپ نے فرمایا کہ شاید وہ اپنے پیچھے ایک بیوی، دو بیٹیاں، بارہ بھائی، ایک بہن اور والدہ چھوڑ کر مرا ہے۔ عورت نے تسلیم کیا کہ صورت واقعہ یہی ہے۔ ایک مرتبہ دوران خطبہ میں کسی شخص نے آپ سے وراثت کا ایک مسئلہ دریافت کیا کہ۔ ایک شخص مر گیا ہے اس کے بعد اس کی بیوی، اس کے والدین اور دو بیٹیاں اس کی جائز وراث ہیں۔ ایسی صورت میں اس کی بیوی کو کیا حصہ ملے گا؟ آپ نے فوراً جواب دیا نواں

حصہ۔ اس مسئلہ کو فریضہ منبریہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ جب آپ نے یہ مسئلہ بتایا تو آپ کوفہ میں مسجد کے منبر پر خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے۔

غرضیکہ حضرت علیؑ کی قوت فیصلہ بڑی تیز تھی اور یہ نتیجہ تھا علم کے استحضار کا اسی بناء پر خود حضورؐ نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا کہ اقضاهم علیؑ۔ اور یہ بات ضرب المثل بن گئی کہ جب کوئی مسئلہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو لوگ بے ساختہ کہا تھیں کہ:

قضية والاثری ابا حسن لها ایک مسئلہ درپیش ہے لیکن اس کے حاصل کرنے کے لیے علیؑ جیسا کوئی شخص موجود نہیں ہے

سَلُونِی عَمَّا شِئْتُم

جو چاہو مجھ سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرلو!

حضرت علیؑ ابن ابی طالب کا علم بڑا تازہ تھا، وہ دنیا بھر کے نظریات و افکار سے پوری طرح باخبر تھے۔ حضرت امام کو کم وبیش پچیس برس کی فرصت کا طویل دور میسر آیا۔ اس پورے عرصہ میں آپ کی توجہ حصول علم کی طرف مبذول رہی اور آپ نے ایک سچے طالب علم کی طرح ہر علم سے آشنائی پیدا کی۔ عربی زبان کی گرامر کی ایجاد کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے اگرچہ سریانی اور یونانی زبانوں کا علم النحو وجود میں آچکا تھا لیکن عربی میں اس علم کو پہلے پہل علیؑ ابن ابی طالب کے نکتہ رس دماغ نے ایجاد فرمایا۔ تواتر کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ آپ نے اپنے شاگرد ابوالاسود دوئلی کو اسم و فعل و حرف کی ترکیب بتائی۔ اس علم کا نام آپ ہی کا تجویز کردہ ہے۔ (فہرست ابن ندیم)

علیؑ ابن ابی طالب نفسیات انسانی سے خوب واقف تھے لوگوں کے جذبات و

احساسات پر ان کی نظر بڑی گہری تھی اور عوامی خیالات ان کی دسترس سے باہر نہ تھے۔ وہ قادر الکلام خطیب تھے۔ اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بالاتفاق عرب کے سب سے فصیح و بلیغ انسان تھے۔ علوم الٰہیہ یعنی علم و طریقت میں دنیا بھر کے صوفیاء و مشائخ کو حضرت علیؑ کی ذات گرامی سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ شبلی، جنید بغدادی، سری سقطی، بایزید بسطامی حارث بن اسد محاسبی، معروف کرخی، حکیم ترمذی اور اسی قبیلے کے دوسرے نامور ائمہ تصوف نے اس نسبت کو،

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ

ذرہ آفتاب تابانیم

کا مصداق قرار دے کر اس پر فخر و مباہات کا اظہار کیا ہے۔ نہج البلاغہ میں علم طریقت و تصوف، مسلک سلوک اور دیگر علوم الٰہیہ کے بارے میں حضرت علیؑ کے ارشاد بکثرت ہیں ان سے آپ کے علم کی وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے برصغیر ہند و پاک میں بیعت و ارشاد کے جو چار سلسلہ قائم ہیں۔ میری مراد چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ سلسلوں سے ہے ان کا مرکزی نقطہ امام عالی مقام کا ذات گرامی ہے۔ ان چار سلسلہ ہائے تصوف سے جو شاخیں پھوٹیں یا ان کے علاوہ جہاں کہیں دیگر مکاتب تصوف قائم ہیں ان سب کی نسبت بھی اسی آستانہ رشد ہدایت سے استوار ہے۔ (ازالۃ الخفاء ولی اللہ دہلوی)

اگرچہ بعض لوگوں نے سلسلہ نقشبندیہ کا تعلق حضرت سلمان فارسی کے توسط سے حضرت ابوبکر سے قائم کیا ہے مگر یہ بے جا تعصب ہی کا ایک مظاہرہ ہے تاکہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی اس خصوصیت میں دوسروں کو بھی ان کا شریک و سہیم قرار دیا جاسکے جب کہ سلمان فارسی اور ابوبکر صدیق کے درمیان کسی رابطہ کا تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔ البتہ

حضرت علی سے انکو روابط کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ بہرحال خانوادہائے تصوف کی حضرت علیؑ کی جانب نسبت عملاً اس بات کا اعتراف ہے کہ امت محمدیہ" علیؑ ابن ابی طالب کو ہر دور میں علوم نبوت کا وارث و امین سمجھتی رہی ہے اور نسلاً بعد نسلٍ ان کی امامت پر امت کا اجماع رہا ہے۔

میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کے بارے میں تجسس کیا تو کسی کو علیؑ سے بڑھ کر عالم نہیں پایا۔ (عبداللہ بن عمرؓ) حضرت علیؑ ابن ابی طالب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام میں علمی تحقیق و تجسس اور فکری تلاش و جستجو کی راہ ہموار کی اور تقلید کے بجائے تنقید کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے بساط بھر تقلید سے اپنا دامن کو بچایا اور مسلک اجتہاد کو فروغ دیا۔ انھوں نے امور خلافت میں اپنے پیش رو خلفاء کی اتباع کو غیر ضروری قرار دیا اور انکی تقلید سے برسر عام انکار فرمایا۔ عمر ابن خطاب کے بعد جب انتخاب خلیفہ کا مسئلہ درپیش تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے جو عثمان بن عفان کے قریبی رشتہ دار اور بہت بڑے سرمایہ دار تھے حضرت علیؑ کو خلافت سے محروم کرنے کے لیئے ایک سیاسی الجھن پیدا کر دی جو حضرت علیؑ جیسے صاحب علم و فضل کے لیئے ہرگز قابل قبول نہ تھی۔ ایک شرط تھی جو عبدالرحمٰن بن عوف کے سازشی دماغ کو بروقت سوجھی۔ انھوں نے حضرت کو خلافت کی پیش کش کی اور کہا کہ وہ یہ اقرار فرمائیں کہ ابوبکر و عمر کی سنت کی اقتدا کریں گے۔ یہ ایک نہ واجب اور گستاخانہ شرط تھی جسے ایک سیاسی اسٹنٹ کے طور پر چھوڑا گیا۔ حضرت علیؑ ابن ابی طالب کا اپنا علم و فضل متقدم الذکر دونوں خلیفوں سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ اور ان کو خود بھی اس امر کا اعتراف تھا اور عبدالرحمٰن بن عوف بھی اس سے ناواقف نہ تھے اور جانتے تھے کہ حضرت علیؑ اپنے اس غیر معقول شرط کو کبھی منظور نہ فرمائیں گے۔ اس موقع پر اگر حضرت علیؑ اپنے علم و اجتہاد کی یہ برملا توہین گوارا

کر لیتے تو خلافت انکے حصہ میں آتی مگر انھوں نے اس ناپسندیدہ شرط کو ماننے سے اعلانیہ انکار فرمایا اور خلافت سے محرومی کو اس اہانت پر ترجیح دی۔ جب کہ ان مدِ مقابل عثمان بن عفان نے بسرو چشم اسے منظور کر لیا۔ (یہ الگ بات ہے کہ شیخین کی سنت سے سب سے زیادہ انحراف انھوں نے ہی کیا) حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے اپنی عمر کے آخری دور میں اپنے بلند مرتبت صاحب زادے حضرت حسنؑ کو جو وصیت فرمائی اس میں بھی تقلید سے بچنے اور دوسروں کی اندھا دھند پیروی سے احتراز کرنے کی تلقین موجود ہے۔ آپ نے فرمایا:

"تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ۔ یہ سب سے بہترین سرمایہ ہے جو تم اپنے لیئے فراہم کر سکتے ہو خدا کے احکام کی اتباع کرو اور اپنے جد محترم اور اپنے اسلاف کرام کے نقش قدم پر چلو۔ اپنے خاندان کی پاکیزہ روایات کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اگر اپنے بزرگوں کی کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو بغیر سوچے سمجھے اسے اپنانے کی کوشش مت کرو جب تک کہ اسکی اچھائی اور برائی کے تمام پہلوؤں سے واقف نہ ہو جاؤ۔ کسی معاملہ پر غور و فکر کرتے وقت خدا سے طلب و اعانت کرو۔ توفیقات الٰہی کو اپنا رہنما بناؤ۔ اور اپنے طرز عمل کی جو توجیہ تم پیش کرنا چاہتے ہو اس کی درست و نادرست ہونے پر پہلے خود اچھی طرح غور کر لیا کرو۔"

صرف یہی ایک وصیت امام برحق علیؑ ابن ابی طالب کے انداز فکر کی ترجمانی کے لیئے کافی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کا اسلام تقلید کا رہین منت نہیں تھا بلکہ وجدان و شعور اور فہم و ادراک کی پوری قوتوں کے ساتھ آپ نے اسے قبول کیا تھا۔ اگر اسلام میں کسی خامی کا وجود ہوتا تو علیؑ ابن ابی طالب کے بارے میں کسی حد تک یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ وہ اسے قبول نہ کرتے۔

ترجمہ: "وہ اللہ اور اسکے رسولؐ سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسولؐ اس

سے محبت کرتے ہیں"۔ سرورِ کائنات صلعم (من حبّ اللہ ورسول)

حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی شخصیت میں محبتِ خدا و رسول کا رنگ سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ فطرت سلیم کی ضیاباریوں سے ان کی روح کا ایک ایک گوشہ منور اور ان کے نفس کا ایک ایک تار جگمگا رہا تھا۔ اسلام ان کے لیئے ایک مذہب اور ایک دین سے بڑھ کر ایک ایسی طبعی ضرورت بن چکا تھا جس کے بغیر انھیں چین نہیں پڑتا تھا۔ ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اسلام کی محبت اس طرح پیوست ہو چکی تھی کہ اگر وہ چاہتے بھی کہ اس سے سر مو انحرف کریں تو نہ کر سکتے۔ انکی رگ و پے میں اسلامی تعلیمات رچ بس گئی تھیں۔ اور انکے جسم میں خون کے بجائے اسلام کی محبت گردش کرتی تھی۔ وہ مجسّم اسلام اور سرتاپا ایمان و یقین تھے اور یہ خصوصیت ان کو لڑکپن ہی میں حاصل ہو گئی تھی اس لیئے کہ ان کا بچپن اور ان کی جوانی براہ راست حضورؐ کی نگرانی میں پروان چڑھی اور اس عظیم الشان درسگاہ سے انھوں نے اسلام کی تعلیمات کا سبق ازبر کیا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

علماءُ اُمّتی کانبیاءِ بنی اسرائیل میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی مانند ہیں۔

اس حدیث گرامی کا اوّلین مصداق علیؑ ابن ابی طالب تھے۔ ان کی علمی جامعیت میں پیغمبرانہ شان جھلکتی ہے۔ ان کی زندگی میں ایک عجیب و غریب تنوع تھا جن پر ان کے سیرت نگاروں کو ہمیشہ حیرت ہوئی ہے وہ ادیب تھے، شاعر تھے، فصیح و بلیغ خطیب تھے، علم وکلام کے موجد، علم النحو کے مؤسس، قرآن کے معانی و مطالب کے غواص، مظاہر فطرت کے رمز شناس اور موت کی حقیقتوں سے باخبر خود آگاہ و خودنگر، منکسر المزاج، متواضع فقیر بوریانشین، صوفی باصفا، عالم باعمل، امام مجتہد، شجاع، وجری، فارس و شہسوار، عابد و زاہد، قانع و متوکل اتنی ساری اس نیک

ایک انسان میں جمع ہو گئیں تھیں۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ایسے عظیم اور گوناگوں صفات کمال کا حامل شخص انسانی تاریخ میں شائد ہی کوئی دوسرا ہوا ہو، یہی وہ جامعیت تھی جسکی بناء پر انھیں انه الجیش فی ذات الله، (وہ تن تنہا اللہ کا ایک لشکر ہے) کا خطاب بارگاہ نبوّت سے عطا ہوا۔ انکا زہد و تقویٰ ان کی نیکی اور پارسائی ان کی صداقت و امانت اور ان کی شجاعت و جوانمردی، ان کی ذہانت و فطانت، ان کی غیرت و حمیت ان کی بے نفسی اور انکا استغنا، ان کی بصیرت و فراست ان کی فصاحت و بلاغت، ان کے دستِ کرم کی فیاضی اور ان کے اخلاق کی بلندی ایسی خوبیاں ہیں جن سے ان کے بدترین دشمن کو بھی مجال انکار نہیں۔ ان کے ناقدین سرگریباں ہیں کہ وہ بیک وقت اتنی صفات کے جامع اور ان اوصاف کے حامل کیوں کر ہوئے۔ علیؑ ابن ابی طالب کی جلالتِ شان کے لیئے تحسین کا ایک بیش بہا خراج وہ ہے جو دوسری صدی ہجری کے ایک عظیم نابغۂ روزگار نے ان کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اعتراف عظمت کے لیئے باعظمت ہونا ضروری ہے۔ امام مشافعی نے حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی صفات عالیہ کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"اجتمع فی علیؑ ابن ابی طالب فضائل لم یجتمع فی غیره الافاد اجتمع فیه العلم والعمل بالكمال فقل مایكن العالم عاملاً واجتمع فیهٖ الفقر والسخاء وقل مایكن الفقیر سخیاً واجمع فیه الفقر والشجاعة ورقة القلب بالكمال وقل مایكن الشجاع رقیق القلب واجتمع فیه الزهد وحسن الخلق وقل مایكن الزاهد حسن الخلق، واجتمع الحسب والتواضع وقلّ مایكن الحسب متواضعاً" (الریاض النضرة)

حضرت علیؓ کی ذات گرامی میں ایسی فضیلتیں جمع ہو گئیں تھیں کہ شائد ہی کسی اور شخصیت میں یکجا ہوئی ہوں۔ وہ علم وعمل کا سنگم تھے حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ عالم بھی ہو عامل بھی ہو۔ وہ فقیر بے نوا بھی تھے اور دل کے غنی بھی۔ حالانکہ یہ دونوں خوبیاں بہت کم کسی میں ملیں گی۔ وہ بہادر تھے اور نہایت نرم دل بھی جبکہ بہادر بہت کم نرم دل ہوتے ہیں وہ زاہد بھی تھے اور خوش اخلاق بھی حالانکہ عموماً زاہد خوش اخلاق نہیں ہوتے۔ ان میں خاندانی عظمت کے ساتھ ساتھ تواضع بھی تھی حالانکہ اونچے خاندان والے لوگ کم ہی متواضع ہوتے ہیں۔

یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی بناء پر حضرت علیؓ ابن ابی طالب محسودِ قران اور محبوبِ روزگار ہوئے ان کی اس شانِ انفرادیت نے انھیں پورے ماحول میں اجنبی بنا کر رکھ دیا۔ وہ صحیح معنوں میں یکتائے زمانہ اور یگانۂ روزگار تھے۔

مشہور مغربی مورخ اور نقاد کارلائل نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی گونا گوں صفات کا تذکرہ بڑے دلچسپ ڈھنگ سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

حضرت علیؓ ابن ابی طالب جیسے جوانمرد انسان سے تم محبت کیے بغیر نہیں رہ پاؤ گے۔ بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں شرافت کا جوہر ودیعت ہوا تھا وہ ایک فیاض نخی اور دریا دل انسان تھے۔ انکی فطرت کا خمیر، قوتِ عمل اور اولوالعزمی، بے باکی جوان مجھ سے تیار ہوا تھا۔ وہ ایک بہترین شہسوار بہادر اور شیر کی سی جرائت وبسالت کے حامل تھے۔ ان محاسن کے ساتھ ساتھ ان میں رقتِ قلب، سوزوگداز، صدق وایمان اور نیکی وپاکبازی کی خوبیاں مستزاد تھیں۔ وہ دل کے صاف اور نہایت راستباز شخص تھے۔ اسی چیز نے ان کی عظمت کو چار چاند لگائے اور پورے ماحول میں ان کی بے داغ شخصیت کو ممتاز ومنفرد کر دیا۔ حضرت علیؓ ابن

ابی طالب کی سی خوبیوں کا شخص اگر خلیفہ نہ بنتا جب بھی اس کی عظمت میں ذرہ بھر بھی کمی نہ آتی اور اگر وہ خلیفہ بن گئے تو اس ان کی شان میں کچھ تو اضافہ نہیں ہوا خلافتِ راشدہ کو اس امر پر ناز ہے کہ علی ابن ابی طالب جیسا مقدس انسان اس کی مسند پر متمکن ہوا۔

ابن حجر مکی نے "صواعق محرقہ" میں احمد بن حنبل اور ابویعلے کی سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

"ولما دخل الكوفه دخل عليه حكيم من العرب فقال و الله يا امير المومنين لقد زينت الخلافة ما زينتك ورفعتها ومارفعتك وهي كانت احوج اليك منك اليها"

جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کوفہ میں تشریف لے گئے تو عرب کا ایک دانشور انکی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا امیر المومنینؓ بخدا مسندِ خلافت کو آپ سے عزت حاصل ہوئی ہے آپ کی عظمت میں اس نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے مقام خلافت آپ کی وجہ سے سرفراز ہوا ہے۔ آپ کی شان خلیفہ بننے سے کچھ بھی تو نہیں بڑھی۔ منصب خلافت کو آپ جیسی عظیم شخصیت کی احتیاج تھی۔ آپ کو اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی"

اور خلافت کا یہ وہ منصب حقیر تھا جس کے لیئے آج بدزبان بے ادب اور گستاخ لوگوں کا ایک ٹولہ حضرت سیدنا علیؓ ابن ابی طالب پر یہ الزام دھرتا ہے کہ وہ ساری عمر اسی منصب کے لیے سرگرداں اور اسی مقصد کے لیئے جوڑ توڑ اور سازشوں میں سرگرم عمل رہے۔ حالانکہ امیر المومنین سیدنا علیؓ پہلے دن یہ تہیہ فرما لیتے کہ خلافت ان کے زیرِ تصرف آجائے تو نہ ابوبکرؓ کی اہلیت کام دے سکتی تھی نہ عمرؓ کی شخصیت کا جادو چل سکتا تھا۔ نہ عثمان کی قرابت ان کے کام آسکتی تھی لیکن وہ اس منصب پر شرعاً اپنا حق سمجھتے ہوئے بھی اس سے یوں بے نیاز رہے

کہ ان کی پوری زندگی میں کسی ایک واقعہ کی نشان دہی بھی نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے کوئی ایسا قدم اٹھایا ہو جو طلب خلافت کے لئے ان کی بے چینی کا غماز ہو۔

شاعر کا یہ شعر ان کے کس قدر حسب حال ہے کہ:

نگاہ کبھی نہیں اٹھتی بلندیوں کی طرف
طلب کا ذکر نہیں، دسترس کہ تیغ نہیں

اقبال ایشیا کا عظیم مفکر اور سرزمین مشرق کا فلسفی شاعر جس کی نظر اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ اور اسلامی علوم پر نہایت وسیع تھی اور جس کے بدترین نقاد بھی اس کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ رفض وشیعیت کی جانب ادنیٰ میلان بھی رکھتا تھا۔ اس نے امیر المومنین سیدنا علیؓ ابن ابی طالب کی شان کو جن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی اس کتاب کا اختتام ان اشعار پر کروں کہ اس سے بہتر اور وسیع تعریف میری نظر سے نہیں گزری۔

مسلم اول شہ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ

از ولائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثل گہر تابندہ ام

نرگسم وارفتۂ نظارہ ام
در خیاباںش چو بو آوارہ ام

زمزم ار جوشد ز خاک من از وست
مے اگر ریزد ز تاک من از وست

خاکم و از مہر او آئینہ ام
می تواں دیدن نوا در سینہ ام

از رخ او فال پیغمبرؐ گرفت
ملت حق از شکوہش فر گرفت

قوت دین مبیں فرمودہ اش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

مرسل حق کرد نامش بوتراب
حق یداللہ خواند در ام الکتاب

ہر کہ دانائے رموز زندگیست
سرّ اسماء علیؓ داند کہ چیست

خاک تاریکے کہ نام او تن است
عقل از بیداد او در شیون است

فکر گردوں رس زمیں پیما ازو
چشم کور و گوش ناشنوا ازو

از ہوس تیغ دو رو دارد بدست
رہرواں را دل بریں رہزن شکست

شیر حق ایں خاک را تسخیر کرد
ایں گل تاریک را اکسیر کرد

مرتضیٰ کز تیغ او حق روشن است
بوتراب از فتح اقلیم تن است

مرد کشور گیر از کراری است
گوہرش را آبرو خودداری است

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

ہر کہ زیں بر مرکب تن تنگ بست
چوں نگیں بر خاتم دولت نشست

زیر پاش اینجا شکوہ خیبر است
دست او آنجا قسیم کوثر است

از خود آگاہی یداللّٰہی کند
از یداللّٰہی شہنشاہی کند

ذات او دروازۂ شہر علوم
زیر فرمانش، حجاز و چین و روم

حکمراں باید شدن برخاک خویش
تا مے روشن خوری از تاک خویش

خاک گشتن مذہب پروانگی است
خاک را اب شوکہ ایں مرادنگی است

مرد خودداری کہ باشد پختہ کار
با مزاج او بسازد روزگار

گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں

حکمراں باید شدن برخاک خویش
تا مے روشن خوری از تاک خویش

خاک گشتن مذہب پروانگی است
خاک را اب شوکہ ایں مردانگی است

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاج او بسازد روزگار

گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں

برکند بنیاد موجودات را
می دہد ترکیب نو ذرات را

گردش ایام را برہم زند
چرخ نیلی فام را برہم زند

می کند از قوت خود آشکار
روزگار نو کہ باشد سازگار

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

آزماید صاحب قلب سلیم
زور خود را از مہمات عظیم

عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیلؑ از شعلہ گل چیدن خوش است

ممکنات قوت مرداں کار
گردد از مشکل پسندی آشکار

حربۂ دوں ہمتاں کیں است و بس
زندگی را ایں یک آئیں است و بس

زندگی قوت پیدا استے
اصل او از ذوق استیلا ستے

(مجلہ کور جعت خورشید "رموز خودی" اقبال ص:۲۸)

فہرست کتب عباس بک ایجنسی اردو مطبوعات

کتاب	مترجم / مصنف	قیمت
قرآن مجید	مترجمہ مولانا فرمان علی (رنگین آرٹ پیپر)	۱۸۰/-
قرآن مجید	" " (بلیک آرٹ پیپر)	۱۵۰/-
قرآن مبین تفسیر المتقین	ترجمہ امداد حسین کاظمی مشہدی	۲۵۰/-
صحیفہ کاملہ	مترجمہ مولانا ہارون صاحب زنگی پوری	۷۵/-
وظائف الابرار (آرٹ پیپر)	مترجمہ مولانا فرمان علی صاحب	۵۵/-
نہج البلاغہ مع خطبہ معجزہ (بغیر الف بغیر نقطہ)	مترجم علامہ مفتی جعفر حسین	۱۷۰/-
توبہ	آیۃ اللہ دستغیب شیرازی	۲۰/-
استعاذہ	" "	۳۵/-
قلب سلیم	" " (مجلد)	۱۲۵/-
گناہان کبیرہ اول دوم	" " (مجلد)	۳۲۵/-
تربیت اولاد (اضافہ شدہ ایڈیشن)	مولانا جان علی شاہ کاظمی	۳۰/-
جناب فضہ	مولانا راحت حسین ناصری	۸/-
مجالس تفسیر آخری عشرہ (۱۲ مجالس)	مولانا سید کلب عابد صاحب	۲۵/-
سیرت امیر المومنین جلد اول دوم	مفتی جعفر حسین صاحب	۲۸۰/-
تحفۃ الابرار	ترجمہ جامع الاخبار شیخ صدوق	۵۰/-
الشافی اول دوم	(کتاب المرتضیٰ) فروغ کاظمی	۱۰۰/-
تفسیر کربلا (مجلد)	فروغ کاظمی	۷۰/-
حضرت عائشہ کی تاریخی حیثیت:	فروغ کاظمی	۲۵/-
فتنہ وہابیت (مجلد)	" "	۷۰/-
سیدہ سکینہ	" "	۳۵/-
حقیقت تبرا	" "	۱۵/-
جدید شریعت	" "	۱۰/-
تفسیر اسلام	(ابتدائے آفرینش سے ظہور امام تک کے حالات)	۲۵۰/-
لعین ابن لعین	(معاویہ ابن ابوسفیان کے حالات)	۲۰/-
عرفان امامت (مجلد)	(حالات امام زمانہ) ظفر عباس کشمیری	۷۰/-
آل محمد کا دیوانہ بہلول دانا	سید عابد وزیر حسن	۲۰/-
تاجدار وفا	(حالات حضرت عباس مع تاریخ درگاہ حضرت عباس لکھنؤ)	۲۵/-
البیان (تفسیر سورۃ الحمد)	سید ابوالقاسم الخوئی	۳۰/-

کتاب	مترجم / مصنف	قیمت
احسن المجالس	ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی	۸۰/-
حکومت الٰہیہ	سید امتیاز حیدر پرتاب گڑھی	۲۰/-
شفاعت	اقبال سید حیدری قمی	۲۰/-
نماز کی گہرائیاں	آیۃ اللہ خامنہ ای دام ظلہ	۳۵/-
چودہ ستارے	نجم الحسن کراروی	۱۰۰/-
حیات القلوب (۳ جلدیں)	علامہ مجلسی	۵۰۰/-
اوم اور علی	سید محمود گیلانی (سابق اہل حدیث)	۸/-
ایلیا	" "	۱۵/-
انتقام خونیں یا خروج مختار	محمد علی البرای	۱۰/-
انسان معاصر اور قرآن	علامہ طالب جوہری	۲۰/-
عالمی معاشرہ اور قرآن حکیم	علامہ طالب جوہری	۸۰/-
تہذیب نفس اور تہذیب حاضر	" "	۸۰/-
قرآن اور سائنس	مولانا کلب صادق صاحب	۴۰/-
حقیقت دین	" " "	۸۰/-
اسلام میں علم کی اہمیت	" " "	۸۰/-
خطبات نماز جمعہ	" " "	۷۰/-
خاندان رسالت خطیب اکبر	مولانا مرزا محمد اطہر صاحب	۸۰/-
مجالس اجتہادی	علامہ نصیر اجتہادی (پاکستان)	۲۵/-
اسلام کا نظام خانوادگی	مولانا سید اختر صاحب	۳۰/-
صرف ایک راستہ	عبدالکریم مشتاق (پاکستان)	۷۰/-
حقائق القرآن	امتیاز حیدر پرتاب گڑھی	۴۰/-
حیات بعد الموت	" " "	۲۵/-
وظائف القرآن	(قرآنی سورہ علی حروف)	۳۵/-
علوم القرآن	مولانا محمد ہارون زنگی پوری	۳۰/-
قرآن اور جدید سائنس	محسن بوکائی	۳۰/-
امامیہ نماز (باتصویر)	مولانا سید منظور حسین نقوی	۲۵/-
اسلام اور جنسیات	ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی	۳۰/-
کائنات روش (مراثی)	باقر علی خان روش لکھنوی	۲۵/-
شعر روش	" " "	۷۰/-
منازل آخرہ (مرنے کے بعد کیا ہوگا)	شیخ عباس قمی	۳۰/-
اٹھو خون حسین کا انتقام لو	سید عابد وزیر حسن	۲۵/-

کتاب	مصنف	قیمت
سوال علی	کوثر نیازی و کلب صادق صاحب	۳۰/-
خطبات جناب زینب	علامہ ابن حسن نجفی (پاکستان)	۳۰/-
معجزہ اور قرآن	علامہ ضمیر اختر نقوی (پاکستان)	۱۰۰/-
روحوں کا سفر	محمد عباس قمر زیدی	۲۰/-
اسرار الٰہی	ماسٹر امتیاز حسین اتر دلوی	۱۰/-
امام جعفر صادق اور سائنسی انکشافات		۵۰/-
بیان حق	منظور الحق فاضل دیوبند	۵۰/-
تہذیب الاسلام	علامہ مجلسی علیہ رحمۃ	۱۰۰/-
مراثی جوش	جوش ملیح آبادی	۶۰/-
رب العالمین دعا اور انسان	محمد علی سید	۳۵/-
کنز الاسرار جدید	ماسٹر امتیاز حسین اتر دلوی	۲۵/-
مجمع العزاء، تاریخ وار نوحوں کا مجموعہ	بدر النساء	۵۰/-
بدر العزاء، تاریخ وار نوحوں کا مجموعہ	بدر النساء	۳۰/-
گلدستہ مراثی	بدر النساء	۶۰/-
نہج البلاغہ کی سیر	انیس فاطمہ، شمیم جعفری	۴۲/-
نفس مطمئنہ	آیۃ اللہ دستغیب شیرازی	۵۰/-
کتاب الخصال	شیخ صدوق علیہ الرحمہ	۱۰۰/-
انتخاب میر انیس، ۱۸ مرثیے ۳۲ سلام ۹۶ رباعیات ہوئے		۶۰/-
منظومہ کربلا (حالات جناب زینبؑ)	سید محمد حسین جعفری	۸۰/-
وسیلہ	حجۃ الاسلام اقبال حیدر حیدری	۴۵/-
درس اخلاق	علامہ دستغیب شیرازی	۳۰/-
ذکر الثقلین	مولانا سید خلافت حسین صاحب بھیک پوری	۸۰/-
شاہان اودھ اور شیعیت	علامہ فروغ کاظمی	۱۰۰/-
آفتاب ظہور مہدی	مولانا سید علی حسن اختر صاحب	۳۰/-
مسجد (مقصد قتل عمد زمہ داریاں)	سید علی شرف الدین موسوی	۲۵/-
عزاداری کیوں؟	" " "	۱۲/-
مبلغ اعظم	مولانا محمد اسماعیل صاحب	۵۰/-
گفتار محسن	علامہ محسن نقوی شہید	۸۰/-
حق و باطل	علامہ مرتضیٰ مطہری	۴۰/-
اسلام میں خواتین کے حقوق	" " "	۱۰۰/-
اجساد جاوداں (تر و تازہ مردے)	علی اکبر مہدی پور	۳۰/-

کتاب	مصنف	قیمت
کرش جعفر	ہمایوں مرزا لکھنوی	۳۰/-
تعقیبات نماز پنجگانہ	مولانا سید نذر محمد صاحب	۳۰/-
تعقیبات نماز (بڑی) ۴۵/-	تعقیبات نماز (پاکٹ)	۹/-
تحفۃ المومنین (پاکٹ سائز) ۱۵/-	زاد آخرت	۱۰/-
دعائے کمیل ۶/-	دعائے سمہ	۸/-
مجموعہ زیارات ۷/-	پنج سورہ جلی حروف رنگین	۱۵/-
حدیث کساء و زیارات ۷/-	حدیث کساء (دلاپ)	۵/-
دعائے معراج و دعائے عہد ۵/-	ذریعہ نجات	۱۵/-
نماز و جنتری مع اوقات نماز	مولانا فرمان علی صاحب	۷/-
الطبیعت فی القرآن	آیۃ اللہ العظمیٰ سید محمد صادق شیرازی	۱۰۰/-
علی فی القرآن	" " "	۱۲۰/-
امام مہدی حدیث رسول کی روشنی میں	" " "	۲۵/-
شہر شہادت	آیۃ اللہ العظمیٰ سید محمد شیرازی	۳۰/-
ایسا ہی ہے حکم اسلام کا	" " "	۱۵/-
رمضان تعمیر و ترقی کا مہینہ	" " "	۱۸/-
تاریخ شیعیان علی	علی حسین رضوی	۲۰۰/-
معظمہ کربلا جناب زینبؑ کے حالات	سید فاضل حسین رضوی	۴۰/-
آسان مسائل	م، رمہدی	۳۵/-
آسان عقائد اول-دوم	گروہ دانشمندان	۱۲۰/-
الامام المجتبیٰ المرتضیٰ	مجتبیٰ علی خاں ادیب الہندی	۵۰/-
قیامت صغریٰ	محمد عباس صاحب قمر زیدی	۳۰/-
جزیرہ برمودہ	محمد عباس صاحب قمر زیدی	۲۵/-
شہدائے کربلا	ضمیر نقوی	۸۰/-
طب نبی اکرم	حیدر مہدی صاحب	۴۵/-
امتحان ہے خون کا	آیۃ اللہ شیخ محمد نجوانی	۳۰/-
موت سے قیامت تک	مولانا سید اختر صاحب	۳۵/-
عزاداری علماء کے نظر میں	علی ربانی خلخالی	۲۰/-
اسلام کی غلام نوازی	مولانا مقبول احمد صاحب نوگانوی	۸۰/-
حیرت انگیز واقعات	دستغیب شیرازی	۶۰/-
عالم برزخ	" "	۲۰/-
سچے واقعات	" "	۳۵/-

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
سیرت فاطمہ زہرا	سلطان مرزا صاحب	۵۰/-
توضیح المسائل	آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی سیستانی	۴۵/-
اعمال حج	سید علی سیستانی دام ظلہ العالی	۳۰/-
وظائف نادعلی	مرتبہ علی رضا	۱۲/-
چاریار	عبدالکریم مشتاق	۲۵/-
الفرقۃ الناجیہ	مولانا سید علی رضوی گوپالپوری	۹۰/-
آیات شفاء	مرزا احمد عباس صاحب	۱۵/-
روح الحیاۃ	علامہ مجلسی علیہ الرحمہ	۱۶۰/-
علامات ظہور مہدی	علامہ طالب جوہری صاحب	۱۰۰/-
سلیم بن قیس ہلالی (تاریخ قدیم کتاب)		۹۰/-
اسلام میں تعلیم وتربیت	علامہ مرتضیٰ مطہری	۷۰/-
حضرت علی کے فیصلے	محمد وصی خاں	۷۰/-
مقالات سید العلماء اول ۔ دوم	مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ	۱۲۵/-
احسن الفوائد باب حادی عشر	علامہ حلی	۸۰/-
اوقات نماز	مرتبہ مولانا ادیب الہندی	۳/-
وظائف الصالحین	سید آصف حسین رضوی	۴۰/-
عورت پردے کی آغوش میں	مرتضیٰ مطہری	۷۰/-
زیارت عاشورہ آثار وفوائد	کرار حسین اظہری مبارک پوری	۲۰/-
حکومت وولایت خدا رسول ائمہ	وزیر عباس حیدری قم	۵۰/-
مصائب المعصوم اول تا ہشتم (مولف حجۃ الاسلام مولانا سعادت حسین خاں صاحب طاب ثراہ)	(چار جلدوں میں)	۴۴۰/-
کتاب الشیعہ	فخر الاسلام سید رضا امام رضوی	۱۲/-
جلاء العیون (جلد اول دوم)	علامہ مجلسی	۲۶۰/-
تعبیر الرؤیا خواب نامہ	علامہ مجلسی	۳۵/-
تحفۃ الذاکرین	سید اظہر حسین رضوی مشہدی	۳۵/-
ذخیرۂ عملیات	ترجمہ الحاج سید عبدالواحد کربلائی	۹۰/-
قرآنی عملیات اول ودوم	آقا محمد تقی ابن محمد باقر	۱۳۰/-
کلید عملیات	مولوی سید برکت علی شاہ	۸۰/-
جواہر انیس	مراثی میر انیس	۱۰۰/-
مجلس شبیر	مولانا شبیر حسین نجفی	۵۰/-
مجھے راستہ مل گیا (مجلد)	ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی	۹۰/-

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
اولین موذن اسلام حضرت بلال	سعید مبین آبادی	۵/-
گلشن معرفت	سید رضا امام رضوی	۳۰/-
نفس المہموم (واقعات کربلا)	شیخ عباس قمی علیہ الرحمہ	۲۰۰/-
مقتل ابی مخنف (قدیم مقتل)	(واقعات کربلا)	۸۰/-
دین حق مذہب اہلبیت	عبدالحسین شرف الدین موسوی	۱۵۰/-
نہج البلاغہ سے منتخب نصیحتیں	بنیاد نہج البلاغہ	۴۰/-
لہوف	سید ابن طاؤس علیہ الرحمہ	۳۰/-
مولائی داستانیں	دستغیب شیرازی	۲۰/-
ثامن الائمہ	امام رضا کے زرین اقوال مع شرح	۲۰/-
عروج السعادۃ معراج السعادہ	علامہ احمد نراقی	۲۰۰/-
قرآنی آیات سائنسی انکشافات	نوریاکی (ترکی)	۹۰/-
تاریخ اسلام مکمل ۴ جلد	علامہ سید علی نقی طاب ثراہ	۱۲۰/-
باقیات وصالحات	سال بھر کے اعمال ودعائیں	۸۰/-
نجم ہوشت حقیقت سلام نوحے	نظیر باقری	۴۰/-
زنجیر نور حقیقت قصیدہ سلام قطعات	نظیر باقری	۷۰/-
عالم عجیب ارواح	سید حسن امکنی	۸۰/-
خطبات فاطمہ زہرا	علامہ ابن حسن نجفی دام ظلہ	۳۰/-
تفسیر فرات	علامہ فرات علی ابن ابراہیم کوفی	۱۲۰/-
انوار غم (مجلس)	مقدس زنجانی ایران	۱۵۰/-
مقتل محسن	محمد باقر انصاری ایران	۳۰/-
ظلمت سے نجات (لعنت قرآن حدیث وتاریخ کی روشنی میں)	محمد وحیدی ایران	۶۰/-
اسلامی جنرل نالج	مولانا سید شہوار حسین امروہوی	۲۰/-
آئینہ ثبات حالات	ڈاکٹر سید کلب صادق مولف فروغ کاظمی	۷۵/-
دعائے ندبہ ۔ ۱۵/-	دعائے جوشن کبیر	۱۵/-
در نجف قطعات امام علی	مرثیہ عباس رضا نیر	۱۲/-
چراغ حرا قطعات (پیغمبر اسلام)	،، ،،	۱۲/-
قرآن اور کائنات کا الوہی تصور	علامہ طالب جوہری	۸۰/-
جدید فقہی مسائل	آیۃ اللہ سید علی سیستانی دام ظلہ العالی	۷۰/-
مناسک حج	،، ،، ،،	۵۰/-
دنیائے جوان	آیۃ اللہ سید محمد فضل اللہ دام ظلہ	۹۰/-

کتاب	مصنف	قیمت
دوستی اور دوست	" " "	۳۰/-
ولایت غدیر	" " "	۴۰/-
معاد (قیامت)	آیۃ اللہ سید عبدالحسن دستغیب	۶۰/-
نہج الاسرار من کلام حیدر کرار	آیۃ اللہ رضا آقا دام ظلہ	۲۲۵/-
توحید الائمہ	مولانا ہارون صاحب قبلہ زنگیپوری	۹۰/-
طب اسلامی اور جدید میڈیکل سائنس	جواد باہنر	۶۰/-
جہاد بالنفس وسائل الشیعہ	شیخ حر عاملی طاب ثراہ	۱۲۰/-
صحیفہ مہدیہ	علامہ سید مرتضیٰ مجتہدی قمی	۱۵۰/-
ذخیرہ قصص	مولانا مظہر حسین صاحب مظفر نگر	۲۵/-
انسانیت کا الوہی منشور	علامہ طالب جوہری	۸۰/-
نہج الفصاحت	خطبات اقوال خطوط پیغمبر اسلام	۲۲۵/-
تفسیر امام حسن عسکری	آثار حیدری	۱۵۰/-
عرفان مودت	پروفسر مجتبیٰ موسوی	۲۰/-
خطیب شام غریباں	علامہ عرفان حیدر عابدی	۵۰/-
العرفان المجالس	علامہ عرفان حیدر عابدی	۵۰/-
جنات وشیاطین	علامہ فروغ کاظمی	۶۰/-
احسن التقویم	سعد اور نحس وقمر در عقرب قرآن اور احادیث کی روشنی میں	----

عباس بک ایجنسی

درگاہ حضرت عباسؑ رستم نگر لکھنؤ۔۳

فون نمبر: 2647590 موبائل 9415102990

E-mail. : abbasbookagency@yahoo.com